لاحاصل

تیسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ

جمیل الدین عالی

پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی
کراچی ۔ لاہور

لاحاصل

اضافوں کے ساتھ

تیسرا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ
۱۹۹۵ء

پاکستان رائیٹرز کوآپریٹو سوسائٹی
۷۰۔ شاہراہِ قائد اعظم لاہور نمبر ۳

طبع سوئم ____ ۱۹۹۵ء

مطبوعہ ____

قیمت ____ U.S.Dollars. 15/- ۱۳۰ روپے

سرِورق ____ محمد جاوید

تعداد ____ ایک ہزار

تقسیم کار

لاہور: کوآپرا بک شاپ اینڈ آرٹ گیلری

۷۔ شاہراہِ قائداعظم

فون: ۷۳۲۱۱۶۱

کراچی: ۵۔ بی ساؤتھ سی ویو ایونیو فیز ۲

ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

فون: 589،517

پہلے ایڈیشن پر عرضِ ناشر

پہلا ایڈیشن

ہم نے عالی جی سے درخواست کی تھی کہ اس کتاب کے سلسلے میں کسی بھی عنوان سے چند سطریں لکھ دیں۔ انہوں نے معذرت کر دی کہ جو کچھ مجھے کہنا تھا، شعر میں کہہ دیا ہے۔ حاشیے اور توضیح کی ضرورت نہیں۔ ہم نے کہا۔ اگر اجازت ہو تو کسی بڑی شخصیت سے دیباچہ، مقدمہ، پیش لفظ لکھوا لیں کہ رسمِ دُنیا بھی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فرمایا، اس کی بھی ضرورت نہیں، اچھا بھی معلوم نہیں ہوتا۔ سبھی محترم نقادوں اور ادیبوں سے میرا کسی نہ کسی سلسلے میں واسطہ رہا ہے، معاملے پڑے ہیں، کوئی خوش رہا ہے، کوئی ناخوش — اب دوستوں اور بزرگوں کو کیوں امتحان میں ڈالتے ہو۔ کسی کو لکھنا ہوگا، تو کتاب چھپنے کے بعد اپنی صوابدید کے مطابق کچھ چاہے گا لکھ دے گا، نہ چاہے گا، نہیں لکھے گا۔

ہم نے اصرار کیا کہ کچھ تو ارشاد ہو۔ فرمایا۔ کیا ارشاد ہو، جو کچھ ہم کہہ سکتے تھے وہ بھی بڑے صاحب کہہ گئے ہیں۔

شکایت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

پھر تامل کیا اور کہا :

جب میرا پہلا مجموعہ بھی نہیں چھپا تھا، تو مجھے یقین تھا کہ مجھ میں بڑے بڑے امکانات ہیں۔ چھپا تو ایسا کچھ اور اتنا کچھ لکھ جاؤں گا کہ عالمی ادب میں تفصیلی ذکر آئے نہ آئے میرا حوالہ ضرور آئے گا۔ اب کہ آدھی عمر گزر گئی اور شعر کا بھی دوسرا مجموعہ آتا ہے، دونوں مفروضات خواب و خیال ہو چکے ہیں۔ اکیلی اُردو ہی اتنی بڑی زبان ہے کہ بڑے بڑوں کے بھی محض حوالے ہی آجائیں تو غنیمت ہے۔ ہم کس شمار قطار میں ہیں۔

پھر سکوت کیا اور فرمایا :

مگر سچی بات یہ ہے کہ اس صورتِ حال سے کچھ فرق نہیں پڑنا چاہئے۔ لکھنے والے بھی دوسری مخلوقات کی طرح ہوتے ہیں۔ بڑے ہوں یا چھوٹے، سب کو پیدا ہو کر ایک وقت تک جینا اور اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔ ازل سے اب تک اربوں انسان پیدا ہوئے، بہت دن جیئے اور مر گئے۔ لیکن تاریخ کے ریکارڈ پر سب کے نام تو نہیں آتے — اور جن کے نام ہیں بھی، نہ جانے اور کب تک باقی رہیں گے۔ ابھی تو خود پوری تہذیبِ انسانی کی تاریخ چند ہزار سال سے زیادہ نہیں۔ وقت کے سمندر میں ایک قطرہ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے پچھلے نام فراموش ہوتے جاتے ہیں، نئے نام اُبھرتے آتے ہیں۔ اگلے ناموں کی بھی یہی کیفیت ہوگی۔ اصل بات یہ ہے کہ سب کو اپنا اپنا کردار ادا کر کے چلے جانا ہے۔ اسی طرح لکھنے والوں کا بھی ایک رول ہوتا ہے انہیں اپنے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور فکر کی کہانی کہنی ہوتی ہے اور بس۔ جس طرح سنا سکیں، جس حد تک سنا سکیں۔ آگے دُنیا جانے، وقت جانے۔

جالی جی کی گفتگو کا یہی اسلوب ہے کہ کتنی بھی سامنے کی بات ہو، وہ زمان و مکان کی گتھیوں میں کھو جاتے ہیں یہ فنکار کی طبعی ناآسودگی کی علامت ہے۔ جو کچھ انھوں نے اپنے بارے میں فرمایا وہ بھی انکسار سے خالی نہیں، ورنہ اُردو شاعری کا میدان بہت ہی بڑا سہی، اس میں ان کا نام بھی ہے، مقام بھی ہے۔

پہلا مجموعہ جالی جی کا غزلیں، دوہے، گیت" ۱۹۵۸ء میں چھپا تھا۔ اس کا استقبال بھی خاصا شاندار ہوا تھا۔ اس وقت پاکستان کے نئے غزل گویوں میں وہ اور ناصر کاظمی مرحوم دو نمایاں معاصر کہلاتے تھے۔ مگر جالی جی محض غزل کے شاعر نہ تھے ان کے گیت بھی عجب رنگ اور رس رکھتے تھے۔ لیکن ان کی سب سے بڑھ کر پذیرائی دوہوں کے میدان میں ہوئی۔ دوہا ایک صنفِ سخن اس دھرتی کی تھی جس کی طرف پرانے اُردو والوں نے توجہ نہ کی۔ بھگت کبیر کو لوگوں نے پڑھا تھا یا پھر جالی جی کو سنا ہے۔ بیچ میں کئی صدیوں کی خلیج ہے۔ انھوں نے اس صنفِ سخن کو آسان زبان کے تجربات سے مالا مال کیا۔ اگلوں کے لفظوں کی جگالی نہیں کی۔ خود فرمایا ہے :

اُردو والے ہندی والے دونوں ہنسی اُڑائیں
ہم دل والے اپنی بھاشا کس کس کو سکھلائیں

یہ ان کی زبان کی روانی اور شادابی کی تاثیر تھی کہ ان کا نام ہندوستان پاکستان میں ہر زبان پر رواں ہوا۔ اور انھوں نے دوہے کہہ کر اور اپنی خاص طرز میں پڑھ کر عدیم المثال شہرت اور مقبولیت پائی۔ انھوں نے دوہے کو اُردو میں حیاتِ تازہ عطا کی ہے۔ اس صنفِ سخن کی ایجاد کا سہرا ان کے سر بندھے نہ بندھے، تجدید کا ضرور بندھے گا۔

پھر ایسا ہوا کہ وہ جہدِ حیات میں اور ہم قلموں کی خدمت کے شوق میں شاعری کے راستے سے بھٹک گئے۔ بے شک ادیبوں کا گلڈ چلایا اور انجمن ترقی اُردو میں تنظیمی اور علمی کام بہت کچھ کیا۔ اس بات کی افادیت میں کلام نہیں۔ لیکن اس میں شاعری کا بہت نقصان ہوا۔ پھر وہ نثر میں جا پڑے، کالم نگاری، سفرنامہ نگاری وغیرہ۔ سب کا اپنا اپنا مقام ہے۔ لیکن ہمیں ایک پلڑے میں ان کی شاعری کو رکھنا ہے، دوسرے میں ان کے دوسرے کاموں کو۔ ان تمام مصروفیات میں شاعری سے پہلو تہی ایک وہبی صلاحیت یعنی ٹیلنٹ کی ناقدری تھی۔ بہرحال دو ڈھائی برس سے آثار ایسے ہیں کہ وہ پھر شاعری کی طرف اور شاعری ان کی طرف مائل ہیں۔

لیکن قارئینِ کرام، قدر شناسانِ ادب، ضخامت میں یہ مجموعہ کیسا ہی ہو، قیمت میں بہت ہے۔ ان کی زندگی کی بیشتر بہترین غزلیں اور بہترین دوہے اور بہترین گیت اس میں شامل ہیں۔ ہاں، جالی جی نے قومی اور ملی نغمے بھی لکھے اور ملک اور بیرونِ ملک ایک بڑے طبقے میں ان کا نام ان کی وجہ سے ہے انھوں نے نازک وقتوں میں قوم کو جو فکری سہارا دیا، اس کا سب اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن ان منظومات کا مجموعہ الگ

ہے گا۔ عالی جی کا کہنا ہے کہ اس مجموعے کا نام "لاحاصل" ہے۔ اور ہم ان کی نظموں اور ترانوں کو لاحاصل کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہم نام بدلنے کو تیار تھے، لیکن وہ تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ وہ مجموعہ "جیوے جیوے پاکستان" کے نام سے اس کے ساتھ ہی لیکن الگ شائع ہو رہا ہے۔

"غزلیں دوہے گیت" کی ترتیب اس زمانے کے رواج کے مطابق تھی — زمانی ترتیب نہ تھی۔ "لاحاصل" کی ترتیب زمانی ہے۔ جو پہلے لکھا وہ پہلے آ رہا ہے۔ یہ کلام بھی لخت لخت تھا، مگر تقریباً سب چھپا ہوا تھا۔ پھر بھی کئی چیزیں ان کے پاس نہ تھیں، ان کے دوستوں اور مداحوں نے فراہم کیں۔ کچھ چیزیں اب بھی رہ گئی ہوں گی، خود ان کو یاد نہ ہوں گی۔

۱۹۷۴ء

دوسرا ایڈیشن

دوسرے ایڈیشن کے بارے میں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اس میں عالی صاحب کا وہ سارا کلام شامل کر دیا گیا ہے جو ۱۹۷۴ء کے بعد کا ہے۔ اس کلام کی ترتیب بھی زمانی ہے۔ (ناشر)

تیسرا ایڈیشن:

ارادہ تھا کہ اس ایڈیشن میں ۱۹۸۴ء کے بعد کا کلام بھی شامل کر دیا جائے۔ لیکن اس کے حجم کے پیشِ نظر اس ارادے کو ترک کرنا پڑا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ۱۹۹۴ء تک کا تقریباً سارا کلام جو متعدد منظومات، غزلوں، دوہوں، گیتوں اور ایک طویل نظمیۂ انسان کے چار ابواب پر مشتمل ہے عالی صاحب کے نئے مجموعے "اے میرے دشتِ سخن" میں شائع کر دیا گیا ہے۔

(ناشر)

عنوانات	صفحہ

○

کلکتے کا نہ ذکر کروں گا میں ہم نشیں
میں نے وہاں وہ وقت گزارا کہ ہائے ہائے

بچپن میں اِک تعلقِ خاطر کِسی سے تھا
وہ سادگی وہ روئے دل آرا کہ ہائے ہائے

سولہ برس کے بعد عجب اِتفاق سے
ملنا ہوا وہ اس سے دوبارا کہ ہائے ہائے

اِک اِک ادا نے عُمر کے دُھندلے نقوش کو
ایسے تڑپ تڑپ کے اُبھارا کہ ہائے ہائے

آبِ رواں میں اُبھرا ہوا مخملیں بدن
شبنم کی اوڑھنی کا سہارا کہ ہائے ہائے

رخسارِ زرد، بجھتی ہُوئی رُوح کے نشاں
آنکھوں میں کشمکش کا نظارا کہ ہائے ہائے

ہاتھوں میں اور گلے میں وہ گجرے گلاب کے
اور سانولا سا رنگ وہ پیارا کہ ہائے ہائے

رہنا الگ الگ مگر اِک اِک نگاہ میں
کِن کِن محبّتوں کا اشارا کہ ہائے ہائے

سادہ سا کوئی شعر بھی پڑھ دُوں تو کس طرح
کرنا یہ اضطراب گوارا کہ ہائے ہائے

ہاں یہ وہی تھی جس نے سرِ راہ دیکھ کر
وہ بے حجاب مجھ کو پُکارا کہ ہائے ہائے

اور اب دوبارہ مل کے بھی دُھندلا گئی وہ یاد
کیا چیز ہے یہ وقت کا دھارا کہ ہائے ہائے

کلکتہ ۱۹۵۷ء

چاند اڑا کر سب ہیں مگن، پر سوچ میں ہیں کچھ لوگ
یہ دھرتی کا مان بڑھا ہے یا دھرتی کے روگ

۱۹۵۰ء

○

اِک نگاہ بے حضور، اِک نگاہ باریاب
یا دوام ہو سکون یا دوام اضطراب

آج بھی مرے خیال بے حصول و بے مآل
آج بھی مرے سوال ناقبول و بے جواب

تا بہ کے رہیں گی یاد چند مہربانیاں
میری بدگمانیاں بے شمار و بے حساب

ہر صدی کے موڑ سے راستے وہی کھلے
لوگ دیکھتے رہے چھُپی حقیقتوں کے خواب

مے بھی جب کبھی ملی ساتھ تشنگی ملی
ایک زندگی ملی وُہ بھی یُوں رہی عذاب

اب وُہ شوخ فتنہ گر کچھ نہیں رہا مگر
ہیں تمام اشتیاق ، وہ تمام اجتناب

تیرے ساتھ عُمر بھر اپنی یُوں ہوئی گزر
ایک آہِ بے اثر ، اِک نمازِ بے ثواب

کوئی جانتا نہیں ، کوئی مانتا نہیں
تیرے ساتھ رہ کے بھی ہم ہوئے بہت خراب

۱۹۵۶ء

○

عالی جی اب آپ چلو تم اپنے بوجھ اٹھائے
ساتھ بھی دے تو آخر پیارے کوئی کہاں تک جائے

جس سورج کی آس لگی ہے شاید وہ بھی آئے
تم یہ کہو خود تم نے اب تک کتنے دیے جلائے

اپنا کام ہے صرف محبت باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے ہم سے جب چاہے من جائے

کیا کیا روگ لگے ہیں دل کو کیا کیا ان کے بھید
ہم سب کو سمجھانے والے کون ہمیں سمجھائے

ایک اسی امید پہ ہیں سب دشمن دوست قبول
کیا جانے اس سادہ روی میں کون کہاں مل جائے

جب تم سب ہو سچے سادھو، میں بھی سچا سادھو ہوں
ایک غریب اکیلا پاپی کس کس سے شرمائے

اتنا بھی مجبور نہ کیجو ورنہ ہم بھی کہہ دیں گے
او عالی پر ہنسنے والے تو عالی بن جائے

۱۹۵۰ء

کنوارا جسم اور کنواری آتما ہے کوئی ایسی نار
ربھگون اب عالی مانگے نئے نئے اوتار

۱۹۵۸ء

کچے محل کی رانی آئی رات ہمارے پاس
ہونٹ پہ لاکھا، گال پہ لالی آنکھیں بہت اداس

تیس روپے میں بیس ہیں اس کے دس لیبو دلال
اتنا مہنگا شہر اور اس میں ایسا سستا مال

اے رانی اب دل پر رکھ کر کھینچ نہ لینا ہاتھ
اے راجہ میں آج تری کل اور کسی کے ساتھ

اے رانی میں سُر ساگر ہوں اور کوئی انمول
اے سُر ساگر مہا کوی بس اپنے بھید نہ کھول

سُر ساگر کی ریت سنی تھی اک اک لہر میں پیار
تیرے سُر کی تال میں نکلی پیسے کی جھنکار

نا ہمیں جانے ، نا ہمیں پرکھے نا سمجھے کوئی بات
یُوں گزرے تو کیا گزرے گی اتنی لمبی رات

اے راجہ جب میں پل بھر میں ہوئی تجھے جنجال
مجھ سے پُوچھ کہ میں نے کیسے کاٹے اتنے سال

---------- ۱۹۵۸ء

○

اب جو یہ میرے بغیر انجمن آرائی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ تم کو مری یاد آتی ہے

یہ جو عالی ہے یہ شاعر نہیں سودائی ہے
یہ تو سچ ہے مگر آگے تری رُسوائی ہے

میرے شکووں پہ نہ جائیں تو وہی ہوں جس نے
بارہا ترکِ محبت کی قسم کھائی ہے

خود بھی گمنام رہیں اُن کو بھی گمنام رکھیں
ہائے وہ لوگ جنھیں نازِ شکیبائی ہے

ہاں بھلا تیرے خد و خال کو ہم کیا سمجھیں
دِل میں یونہی تری تصویر اُتر آئی ہے

ان کو آزردہ بھی کرتے نہیں بنتی ورنہ
اپنی باتوں پہ بھلا کس کو ہنسی آئی ہے

ہم نے صحرا میں بھی رہ کر جو پکارا ہے تجھے
کتنے غنچوں کے چٹکنے کی صدا آئی ہے

اہلِ شہر، اہلِ چمن، اہلِ قفس خیر تو ہے
کیا خبر بھی نہیں آئی کہ بہار آئی ہے

میری ہنگامہ پسندی پہ نہ الزام رکھو
شاید اک یہ بھی علاجِ غمِ تنہائی ہے

۱۹۵۰ء

○

پنڈی دیس میں کویتا پڑھنے عالیؔ جی کیا آئے
کوئی غزلوں پر سر دُھن لے کوئی دوہوں پر مٹ جائے

کہیں مدرا کا مینہ برسے اور کہیں دعوت کی دُھوم
کوئی بڑھ کر سینے سے لگالے اور کوئی لے چُوم

کوئی پُستک پر نام لکھا کر خوشبوؤں سے بسائے
کوئی پٹو پر دوہے کاڑھے اور سب کو دکھلائے

کوئی کہے تری بانکی غزلیں ہر پریمی کا مان
کوئی کہے ترے تیکھے دوہے سخت کٹیلے بان

روز اک محفل اور ہر محفل ناریوں سے بھرپُور
پاس بھی ہوں تو جان کے بیٹھیں عالیؔ سب سے دُور

بھولے بھٹکے اِدھر اُدھر کو جب بھی آنکھ اُٹھائیں
گھر والی کی چوکس نظریں چپکے ہی چپکے کھائیں

کوئی سادہ سی کامنی مُورت کوئی ہزاروں بھیس
کوئی بولے اور برسیں پھُول اور کسی کی چُپ سندیس

نا یہ پھُول مرے دامن کے نا وہ میرے نام
میرے بہانے لوگ نکالیں اپنے اپنے کام

ظاہر اچھے گھرداروں کا باطن پاپی چور !
کیا کوُکے گا، کیا ناچے گا چڑیا گھر کا مور !

رائے تجمل سین کی محفل اِک ہنستا بازار
کیسی چھُوئی مُوئی، کیسے گیندے، کیسے کھلے انار

اِس محفل میں کون نہیں ہے ہاں مرا یار نسیم
سب سے الگ اور سب سے انوکھا وُہ ہرجائی قدیم

بچپن سے ہم ساتھ ہیں کتنے اور ہیں کتنی دُور
دونوں اِک دُوجے کے پریمی اور دونوں مہجُور

ہرجائی پر اِن کا بھی لکھو نام ضرور
کِتنا میٹھا، کتنا رسیلا اور کتنا مغرور

اور میجر منّان کہ سب سے ناخوش سب کا یار
دھیما دھیما، تیکھا تیکھا، گھُلا مِلا بیزار

کیسے کیسے کہنے والے ہیں پنڈی کا مان
عالیؔ اُن کے سامنے آئے یہ اللہ کی شان

باقیؔ جس کی غزلیں اس کے نام کے رُوپ دکھائیں
ہائے رے پنڈی والے اس سے کیا کیا بوجھ اُٹھوائیں

جعفرؔ طاہر شبد کا راجہ دُھن اور لے کی آس
ہائے رے پنڈی والو تم نے اسے دیا بن باس

یوسف ظفر کی نظمیں جیسے اگنی اُوپر ناگ
ہائے رے پنڈی تو نے اِسے بھی دے ہی دیا بیراگ

اور مختار کہ دیکھ کے جس کو آئیں بخاری یاد
ہائے رے پنڈی تو نے کیا کیا گُنی کیے برباد

مُنہ سے نہ بولے سر سے نہ کھیلے اور مجسّم پیار
میری جان عمر شرپا بھی پنڈی دیس میں خوار

فطرت جس کو خُود قدرت نے شعر کیا الہام
پنڈی والے اس کو ڈُاک کے ٹھیکے دیں اِنعام

کرموں والا کرم کہ جس کی لے کا اپنا اُنگ
پنڈی والے مری میں رکھیں اس کو بھی بے رنگ

کام کلا اِن سب کا جیون کویتا ان کی ریت
کیا عالی کے دوہے بھیّا کیا عالی کے گیت

۱۹۵۸ء

○

چھم چھم چھم چھم چھم کِرنیں برسیں پرن پکھا وج تھاپ
تم ہی کہو اب ایسے سمے میں کیا پُن ہے کیا پاپ

چھنن چھنن چھن چھنن چھنن چھن گھُنگھرُو جیسی باج
چال دِکھائے کویتا رانی دُھن سوچے کویراج

چال دِکھائے کویتا رانی، اور سب سُر لہرائیں
اب جو سمے پل بھر بھی ٹھہرے لوگ امر ہو جائیں

۱۹۵۸ء

○

باتیں بہت سنیں عالی کی اب سُن لو یہ بانی
جس نے بنگلہ نار نہ دیکھی وہ نہیں پاکستانی

ہولے ہولے نرکا ڈولے گائے ندی بھٹیالی
گیت کنارے، دوجے لہریں اب کیا کہوے عالی

پیچھے ناچیں ڈاب کے پیڑ اور آگے پان سُپاری
اِنہی ناچوں کی تھاپ سے اُبھرے سانوری بنگلہ ناری

سانوری بنگلہ ناری جس کی آنکھیں پریم کٹورے
پریم کٹورے جن کے اندر کن کن دُکھوں کے ڈورے

دُکھوں کے ڈورے مٹ جائیں گے جب کوئی پیارے چومے
لیکن پیار سے چومنے والا دریا دریا گھومے

دریا دریا گھومے مانجھی پیٹ کی آگ بُجھانے
پیٹ کی آگ میں جلنے والا کس کس کو پہچانے

کس کس کو پہچانے مانجھی نینوں کا رس سوکھا
نینوں کا رس سوکھتا جائے مانجھی سوئے بھوکا

بھوکی نیندوں والے مانجھی ہم پچھم سیلانی
ہم پچھم سیلانی مانگیں سبزہ، رُوپ جوانی

سبزہ رُوپ جوانی ہو اور سُندر بن کی چھایا
سُندر بن کی چھایا میں چھپ جائے جیون مایا

ہم پچھم سیلانی مانجھی آنے جانے والے
کب ہُوئے آنے جانے والے روگ مٹانے والے

یہ تیری لوہا لاٹ سی بانہیں جن سے ڈریں منجدھاریں
ان بانہوں کو چار طرف سے کتنے دھیان پکاریں

او مانجھی سُن دھیان پکاریں آپہنچے وہ کنارے
اِک ترے من میں جوت جگے تو چھٹ جائیں اندھیارے

او مانجھی تو اپنے ہی من میں دھیان کی جوت جگا لے
کب ہوئے آنے جانے والے روگ مٹانے والے

۱۹۵۹ء

پاکستان کتھا

اس کلجگ نے دِل والوں سے جو جو بوجھ اٹھوائے
ایک بھی جس پربت پر رکھ دیں وہ پربت پھٹ جائے

عالی اپنے دیس کی لکھیں اور ٹوڈی کہلائیں ،
سُورما لوگ بدیسی پیسے کھائیں اور اِترائیں

پیسے کھانے کی ترکیبیں نقد وظیفہ سیر
اب جو کوئی جس کا کھائے مانگے اُسی کی خیر

کوئی کھُل کر جاپان گھمائے اور کوئی چھُپ کر چین
کہیں بدیسی ڈفلی باجے کہیں بدیسی بین

پی۔ای۔این[1] کے گُوجن ہارے جگ کی سیر کو جائیں
عالی دیسی سبھا جما کر اپنی ہنسی اُڑوائیں !

جن کے پڑوسی بھی نہیں جانیں ہیں ان کے شبھ نام
لندن ، بمبئی ، ہالی وُڈ میں وہ سب کو سیتا رام

---

[1] سی۔آئی۔اے کے پیسے سے چلنے والی پوئٹس۔ ایسے اسٹس اینڈ ناولسٹس (انجمن)

کوئی پھٹ بھیا پیرس پہنچے اور لیکھک بن جائے
کوئی افسر نیویارک کے بل پر کتھا کلا سکھلائے

ہائے وہ دوت گھروں کی شامیں وہ انجانے کھوج
شیتل مدرا، جلتی ناریں، میٹھے میٹھے بھوج

برہم گیانی گگن وچاری بدھی جائیں بھول
ایسے ہنس ہنس بولیں جیسے رواں رواں ہو پھول

واپس گھروں کو ٹھنڈے پہنچیں لے کر من میں آگ
اے بھگوان بس اب تو جگا دے اپنے سوئے بھاگ

کوئی کٹھ پتلی سبھا رچائے کوئی افسر پر چھائے
جب یہی روز کے دھندے ٹھہرے ایک نہ اک چل جائے

کویتا، شکشا، چتر کلا کا سودا روز کا کھیل
اندر من کی آنکھیں نیچی باہر مونچھ پہ تیل

دس ڈالر میں شولوخوف کو ننگا ناچ نچائیں
دس روبل میں ہیمنگوے کے سوسو عیب گنائیں

ابھی پاؤں میں ٹوٹی جوتی ابھی کمر میں شال
یہ ہر اک بانی کے باسی نا کالے نا لال

کیا کیا جنتر منتر والے بن گئے گرنتھ کار
مایا مہا ٹھگنی ہے بابا اس کے روپ ہزار

کوئی چھیل والا، کوئی بل والا، کوئی کپٹ کرپان
کوئی سمبندھک، کوئی سن یوجک، کوئی سبھا پردھان

کھی کھی کرنے والے نردہ ہی ہی کرتے بھانڈ
زل مل کلا کے پیچھے یوں دوڑیں جیوں سانڈ

رت کے ساتھی، سمے کے سنگی بے دھرمے بے ذات
جو جس دم ہو ان کا افسر اونچی اسی کی بات

افسر بولے یارو ہم کو بھائے نہیں اِقبالؔ
یہ بولیں جی شبد کا دھوکا دھیان کا خالی جال

افسر بولے دینو بھاٹ کی کویتا میں سو ٹھاٹ
یہ بولیں جی کالیؔ داس کا باپ ہے دینو بھاٹ

افسر بولے چیتر کلا کو کیا جانے چغتائیؔ
یہ بولیں جی اس سے بڑھ کر اپنی بیداںؔ مائی

افسر بولے روشن آرا کیا سمجھیں سُر تال
یہ بولیں جی سُر اوتار تو ہے جُمّنؔ قوال

افسر بولے فیضؔ نراجی یہ بولیں غدّار
افسر بولے اپنی انگھڑ یہ بولیں مکّار

افسر بولے کوئی عالیؔ کو چپ رہنا سکھلاؤ
یہ بولیں جی چُپ نہ رہے تو ملک بدر کرواؤ

عالی کا کیا دوش ہے بھیّا جو ہر کوئی بل کھائے
عالی سب کے من کا کانٹا جب اُبھرے چُبھ جائے

اونچے اونچے جن کے سنگھاسن بڑے بڑے گودام
اپنی دکھی کلا نگری میں ان کا بھلا کیا کام

نا یہ جیون بھید کے روگی نا انھیں ہر دم سوچ
نا یہ دن کی سختی جانیں نا یہ رات کا لوچ

نا انھیں دیپک راگ جلائے نا یہ میگھ پہ روئیں
نا یہ کھو کر پانا جانیں نا یہ پا کر کھوئیں

نا ان سے کوئی بھول ہو نا یہ مُفت کے رنج اٹھائیں
نا یہ بیری شما کریں اور نا یہ مِتر گنوائیں

ان کے لیے تو اُن کا پورا جیون ہے بیوپار
ان کے لیے تو ان کے سوا ہے خالی سب سنسار

ان کا دھندا پلّو بندھن یہ سب کے دلال
یہ کیا جانیں یہ کیا سمجھیں اپنے دیس کا حال

وہاں کہاں جیوتش کے دھندے جن سے پھانسیں نار
وہاں تو ہے ہر ہاتھ کی ریکھا جیتے خون کی دھار

سُوکھے جسم اور بھوکی رُوحیں مانگیں جن کی لاکھ
کیا کیا ہیرے کیا کیا موتی بنتے جائیں راکھ

کتنی ہیریں کتنے رانجھے اِک دُوجے سے دُور
یہ کیوں سمجھیں یہ کیوں جانیں کون ہے کیوں مجبور

لندن پریم لگن میں کس کو چک جھمرے[1] کی سُوجھ
او دیسی یہ دیس پہیلی تو اسے خود ہی بُوجھ

دُور ہی دُور سے آس کی کرنیں چمک دمک دِکھلائیں
جن کے گھروں میں گھور اندھیرے اُن کے پاس نہ آئیں

---

[1] چک جھمرہ تحصیل چنیوٹ کا گاؤں جہاں مرحوم شاعر احمد ریاض کی بیوہ اور بچی رہتی تھیں۔

آج بھی اپنے کرتا دھرتا سنیں انھی کی بات
کل تک جن کا دھرم تھا سونا روپا جن کی ذات

آج بھی کتنی کومل کلیاں کانٹوں کی خوراک
آج بھی کوئی نہیں پہچانے کیا کندن کیا خاک

بس اگلیں ہیں جن کی زبانیں سڑ گئے جن کے نام
آج بھی جب دھن برکھا برسے آئے انھیں کے کام

آج بھی ہاری کھیت کو ترسے کاریگر بے کار
آج بھی بچے ان پڑھ گھر میں اور مائیں بیزار

آج بھی روئے کوئل بانی کوے ماریں تان
آج بھی دیر کھلے سینے اور بھانڈ چلائیں بان

آج بھی پربھا کا لک پیسے اُوشا نیر بہائے
آج بھی چھایا کتھک ناچے مایا گیان سکھائے

سو رنگوں کے سو بادل ہیں چار طرف سے گھیر
سُورج تڑپ تڑپ رہ جائے دُور نہ ہو اندھیر

عالیؔ تو جو چاہے کہے ظاہر ہے ترا انجام
سو راون ترے بیری اور تو نا لچھمن نا رام

۱۹۵۹ء

الجبرا یا بانی

بے بس بے ہتھیار کلا نے بھیجا ہے پیغام
جو نہ لکھے الجبرا یا بانی اس پر شعر حرام

اس پیغام کو خون کی دھاریں بہہ بہہ کر چمکائیں
خون کی دھاریں جن کے سوتے خشک نہ ہونے پائیں

خشک نہ ہونے پائیں یہ سوتے بنتے جائیں تال
گہرے گہرے خون کے تال کھڑا دیکھے ڈبگال

اس ڈبگال کا دیس ہے روسو والٹیر کا دیس
روسو والٹیر کے دیس نے بدلے کیا کیا بھیس

اک وہ بھیس کہ جس کی گرمی راکھ کرے بستیل
اک یہ بھیس کہ جس پر روئیں راوی، دجلہ، نیل

راوی، دجلہ، نیل جو روئیں گنگا جمنا روئیں
گنگا جمنا نام اشارے جگ کے دریا روئیں

جگ کے دریا روئیں مگر یہ چپ بیٹھا شرمائے
چپ بیٹھا شرمائے کہ عاقی حلوا روٹی کھائے

حلوا روٹی کھا مرے پیارے پی شمپین کے جام
تو جس دیس کا راگ الاپے وہاں ترا کیا کام

وہاں ترا کیا کام جہاں پر گھومیں لاکھوں ناگ
لاکھوں ناگ اور ایسے جن کے روئیں روئیں ہیں آگ

برسے آگ الجیریا پر اور بھڑکیں سات آکاش
سات آکاش بھڑک کر کہویں ہونا نہیں نراش

ہونا نہیں نراش کہ بیارو جاگ اٹھے ہیں ضمیر
بزدل کا بھی من جاگے تو سو ویروں کا ویر

جاگا جگ اور ہاتھ اُٹھے اور کھنچ گئی ایک کمان
کھنچ گئی ایک کمان کہ جس سے چھوٹیں پل پل بان

چھوٹیں بان اور پیرس رانی سہمی جائے
پیرس رانی ڈری تو پنڈت یو این بھی گھبرائے

یو این جی کا جنتر منتر دھن اور گیان اور دھیان
آج نہیں تو کل دیکھیں گے سمے بڑا بلوان

دو سو برس پہلے چھینا تھا یونہی تمہارا تاج
پیرس رانی آنکھیں کھولو پرجا مانگے راج

۱۹۶۰ء

○

ہم کو یورپ میں کراچی کی فضا یاد رہی
وہی گرمی وہی مرطوب ہوا یاد رہی

ایک ہنگامہ ہے لندن مگر اس میں بھی ہمیں
تیرے ہی دل کے دھڑکنے کی صدا یاد رہی

شامِ پیرس نے بہت رنگ دکھائے ہم کو
اور وہی سادگیٔ رنگِ حنا یاد رہی

مہرباں غمزہ کناں ماہ وشانِ روما
حیرتی ہیں کہ ہمیں کس کی وفا یاد رہی

کیا وہ سیلاب تھا اس قوسِ قزح کا جس میں
ایک اپنی ہی کرن سب سے جُدا یاد رہی

سحرِ برلن سے ہی پوچھو تو گواہی مِل جائے
وہی سرمستیٔ لاہور سدا یاد رہی

جھیل لیمان کا منظر وہ سرورِ ابدی
کوئی تو بات ہمیں اس سے سوا یاد رہی

ایمسٹرڈم میں جو طوفانِ گل و لالہ مِلا
اس میں بھی زرد چنبیلی کی ہوا یاد رہی

ارضِ ڈینیوب کہ نغموں کا سمندر ہے وہاں
لبِ مہران کی پُرسوز ندا یاد رہی

اس طلسمات سے آنا کوئی آسان نہ تھا
وہ تو کہیے کہ ہمیں لغزشِ پا یاد رہی

۱۹۶۱ء

لندن جس کا شور تھا اتنا نِکلا پیار سے خالی
گھومے کیا کیا نار نویلی ٹک ٹک دیکھے عالیؔ

لندن بھی مرے جیون جیسا کچھ دھولا کچھ کالا
تھوڑی دِہسکی باقی پانی بھدّا نِکھد پیالا

۱۹۶۱ء

جسے یہ چھُو لیں بنے وُہ سونا آپ یہ خالی ہاتھ
عاؔلی جی کا نام پڑا ہے مرزا پارس ناتھ

١٩٦٢ء

○

کچھ دن گزرے عالی صاحب عالی جی کہلاتے تھے
محفل محفل قریے قریے شعر سنانے جاتے تھے

قدرِ سخن ہم کیا جانیں ہاں رنگِ سخن کچھ ایسا تھا
اچھے اچھے کہنے والے اپنے پاس بٹھاتے تھے

دوہے کہنے اور پڑھنے کا ایسا طرز نکالا تھا
سُننے والے سر دُھنتے تھے اور پھر دوں پڑھواتے تھے

سامنے بیٹھی سُندر ناریں آپ طلب بن جاتی تھیں
پردوں میں سے فرمائش کے سو سو پرچے آتے تھے

فیشن تھا یا خوش آوازی یا کچھ سحرِ جوانی تھا
کبھی کبھی تو ان پر گھر کے گھر عاشق ہو جاتے تھے

غزلوں میں سو رنگ ملا کر اپنا رنگ اُبھارا تھا
استادوں کے سائے میں کچھ اپنی راہ بناتے تھے

گیتوں میں کچھ اور نہ ہو اِک کیفیت سی ہوتی تھی !
بول برابر رقصاں رہتے معنی ساز بجاتے تھے

اہلِ ہُنر کی خوشہ چینی ان کو وجہِ سعادت تھی
بے ہنروں میں اپنی انا کا پرچم بھی لہراتے تھے

"غزلیں، دوہے، گیت" کی شہرت ملک سے باہر پھیلی تھی
ہندوستان سے آنے والے تحفوں میں لے جاتے تھے

اپنی لگن اور اپنی جلن اور اپنی چبھن کی مستی تھی
نا ڈرتے تھے نقادوں سے نا خود سے شرماتے تھے

جلسوں میں اور ہنگاموں میں جب تنہائی ڈستی تھی
باغوں میں اور ویرانوں میں جا کر دل بہلاتے تھے

عشق تو اِن سے کیا ہوتا ہاں پیار میں جیسی کچھ گزرے
جس انداز سے جن لفظوں میں آجائے کہہ جاتے تھے

اِک چھوٹی سی دنیا جس کے دُکھ سُکھ بھی چھوٹے چھوٹے
کچھ سختی میں کچھ نرمی میں ان کے دِن کٹ جاتے تھے

پھر یہ دیکھا لڑکے بالے ہنستے تھے اور عالی جی
فردیں لکھتے مسلیں پڑھتے بیٹھے گلڈ چلاتے تھے

۱۹۶۲ء

○

سرِ حقیقت ہاتھ نہ آیا بھول گئے افسانے بھی
پہلے ہی کیا کچھ تھے عالیؔ اب ٹھہرے فرزانے بھی

دیکھیے دل کی آنچ پہ کب تک گرمیِ محفل جائے گی
راکھ ہوئے سب باہر والے شمعیں بھی پروانے بھی

اتنے برس کی شدّتِ عشق اور شہرتِ شعر کا یہ انجام
آپ ہمارے پاس سے گزرے اور ہمیں پہچانے بھی

ہائے یہ اندر کی تنہائی جس کے لیے ہم چھوڑ آئے
تیرے شہر اور تیرے قریے اور اپنے ویرانے بھی

کب سے ہم انصاف کے پیاسے جلتے ہیں اور کہتے ہیں
کوئی نہ کوئی صدی آئے گی اپنی آگ بجھانے بھی

آخر ان سوکھے ہونٹوں پر مستیِ ذات اُبھر آئی!
اب اس میں سب جل جائیں گے ساغر بھی میخانے بھی

منتظرِ اظہار پڑے ہیں عالیؔ کتنی مدت سے
کتنے دکھ جانے پہچانے کتنے دُکھ انجانے بھی

۱۹۶۳ء

مجھے مِلے جیون ساگر سے کچھ یادوں کے جزیرے
انہی یادوں کے جزیروں میں ہیں پتھر، موتی، ہیرے

۱۹۶۳ء

کِس کِس گھر کی نیو رکھو اور کیا کیا کنج بناؤ
عاؔلی جی تم آپ گھروندے تم ہی ٹوٹ نہ جاؤ

۱۹۶۳ء

یہ پیپل کی چھاؤں گھنی اور یہ ڈھلتے ہوئے سائے
کوئی ہمارے ساتھ ہے اور کوئی رہ رہ کر یاد آئے

۱۹۶۳ء

○

جیسے اک دیوی کے گُن ہوں کام، کلا، سنگیت
جب کبھی کہنا ایسے ہی کہنا غزلیں، دوہے، گیت

جب کبھی جلنا ایسے جلنا باقی بچے نہ راکھ
راکھ بچے تو گر جائے گی من اگنی کی ساکھ

جب کبھی لکھنا، چاند سے لکھنا سُورج سے اشلوک
سُورج جس کی روشنیوں میں کوئی روک نہ ٹوک

جب کبھی گانا گاتے ہی رہنا کھینچتے رہنا تان
اس اک تان کی آس پہ جس میں کھنچ جائیگی جان

عالیؔ کا کیا ذکر کرو ہو کوئی تو وہ کہلائے
جو ناخن سے پربت کاٹے اور پربت کٹ جائے

۱۹۶۲ء

○

کب تم بھٹکے، کیوں تم بھٹکے، کس کس کو سمجھاؤ گے
اتنی دُور تو آ پہنچے ہو اور کہاں تک جاؤ گے

اس چالیس برس میں تم نے کتنے دوست بنائے ہیں
اب جو عمر بچی ہے اس میں کتنے دوست بناؤ گے

بچپن کے سب سنگی ساتھی آخر کیوں کر چھُوٹ گئے
کوئی یار نیا پُوچھے تو اس کو کیا بتلاؤ گے

جو بھی تم نے شہرت پائی جو بھی تم بدنام ہوئے
کیا یہی ورثہ اپنے پیارے بچوں کو دے جاؤ گے

اب اس جوشش خود آگاہی میں آگے کی کیا سوچی ہے
شعر کہو گے، عشق کرو گے کیا کیا ڈھونگ رچاؤ گے

عاؔلی کس کو فرصت ہوگی ایک تمہیں کو رونے کی
جیسے سب یاد آجاتے ہیں تم بھی یاد آجاؤ گے

۱۹۶۶ء

○

نرناری کی باتیں چھوڑو، یہ باتیں ہیں پرانی
چھٹ بھیّوں کی سُنو کہانی چھٹ بھیّے کی زبانی

دیس کو گورے چھوڑ گئے پر چھوڑ گئے اِک پھوڑا
اس پھوڑے نے رس رس کر نس نس سے ناتا جوڑا

اس پھوڑے کا نام تھا افسر ذات تھی نوکرشاہی
نوکرشاہی ذات پُرانی اس نے سب سے نباہی

چیچک پھیلے ہیضہ پھیلے پھر بھی اِک دن ٹوٹے
نوکرشاہی روگ نرالا لگ کر کبھی نہ چھوٹے

روشنی چھوڑ دیں چاند اور سُورج جب کبھی شکتی دمکے
بدھی بچل بچل بہہ جائے جُوں جُوں کرسی چمکے

افسر یوسف افسر کبیو بڈ افسر ہفت ہزاری
پریم کے جگ میں جیتے افسر، ہارے کرشن مراری

نار بھی آخر جان رکھے ہے افسر کو کیوں چھوڑے
بھو کی سوئے ننگی جاگے کو دیتا ہے سر پھوڑے

افسر رومی افسر رازی افسر بو علی سینا
یارو ایسی بات ہے کوئی جو افسر نے کہی نا

راکھ بنا دے غزلوں، دوہوں، گیتوں کی ہریالی
افسر آن کی آن میں کر دے مالی جی کو خالی

۱۹۶۶ء
______

۲۳ مارچ

تھر تھر کانپے کاغذ اور سیاہی اُڑتی جائے
سچ کا بوجھ ترازو جھوٹی کتنی دیر اٹھائے

عالیؔ تو نے اتنے برس اس دیس کی روٹی کھائی
یہ تو بتا تری کوِیتا رانی دیس کے کیا کام آئی

کیا نہیں بھاتی آنکھ کو تیری دُکھ کی کوئی تصویر
تیری غزل کے مضمونوں سے دُور ہے کیوں کشمیر

جب تجھے بھائے پاکستان کے نام پہ شہرت پائے
جب تجھے بھائے بھیس بدل کر جگ باسی بن جائے

سچے سُر جب گلے سے نکلیں سچی جب ہو تھاپ
ہم نے دیکھا کویتا رانی ناچی آپ سے آپ

۱۹۶۷ء

○

یہ جو مری لے اور لفظوں کے رنگیں تانے بانے ہیں
سُننے والو! غور نہ کرنا یہ سب راگ پُرانے ہیں

سُننے والو! غور نہ کرنا ورنہ کھل ہی جائیں گے
کتنے خالی بھید ہمارے جواب تک افسانے ہیں

سُننے والو! غور نہ کرنا ورنہ صاف سمجھ لو گے
ہم نے جتنے نام لیے تھے آج بھی سب انجانے ہیں

سُننے والو! غور نہ کرنا ورنہ خفا ہو جاؤ گے
جن کو ہم نے دوست کہا ہے وہ ہم سے بیگانے ہیں

سُننے والو: غور نہ کرنا ورنہ ہمیں ٹھکرا دو گے
ہم اندر سے سخت کمینے باہر سے دیوانے ہیں

سُننے والو! غور نہ کرنا ورنہ پتہ چل جائے گا
ہم نے جتنے باغ سجائے وہ اب تک ویرانے ہیں

سُننے والو! غور نہ کرنا ہم بے سُر ہو جائیں گے
جب تک تم سر دُھنتے رہو گے سارے گیت سُہانے ہیں

سُننے والو! غور نہ کرنا ورنہ تم جاگ اُٹھو گے
ہم کچھ سچے اور کچھ جھوٹے خوابوں کے ویرانے ہیں

۱۹۶۷ء

○

منفعل تھا ترا جلوا کیا کیا
ہم نے سمجھا ترا منشا کیا کیا

ایک ہے لفظ محبت جس سے
مسئلے ہوتے ہیں پیدا کیا کیا

تو ہی خود دیکھ کر تیرے لیے کام
کر گیا حرفِ تمنا کیا کیا

کیسے کیسے کر تجھے بن دیکھے
تجھ سے ملتا ہے سہارا کیا کیا

جب نہ دیکھا اُنہیں دیکھا ہی نہیں
جب بھی دیکھا انہیں دیکھا کیا کیا

کس قدر سخت مقام آئے تھے
ہم نے رکھا ترا پردہ کیا کیا

ہم جو دیوانے نہیں ہو جاتے
دیکھتے لوگ تماشا کیا کیا

بجھ گیا شعلۂ دل خیمہ ہوئی
بھڑک اٹھتا تو بھڑکتا کیا کیا

کھا گئی کون سیاہی مجھ کو
ہائے یہ رنگ ابھرتا کیا کیا

آج تھا رونقِ محفل عالی
تم نہ آتے تو وہ پڑھتا کیا کیا

۱۹۶۷ء

"نذرِ ناصر کاظمی"

تا ابد ایک ہی چرچا ہوگا
کوئی ہم سا کوئی تم سا ہوگا

اِسی تاریک زمیں کا منظر
چاند پر چاندنی جیسا ہوگا

سُورج آیا ہے مری سمت مگر
دوسری سمت اندھیرا ہوگا

کاش پہلے سے کوئی بتلا دے
کس طرح ذکر ہمارا ہوگا

وُہ نہیں آئے گا اِس محفل میں
دُور ہی دُور سے سُنتا ہوگا

ہم نہ بولیں تو ہمارا منصب
تم نہ پوچھو گے تو شکوا ہو گا

آئی بے ساختہ ہر شعر پہ داد
کتنے معنی نہیں سمجھا ہو گا

کون تھا جس نے رکھی سب سے امید
ہاں تو وہ شخص مجھی سا ہو گا

کون تھا جس سے ہُوئی طے منزل
ہاں تو پہلے وہ بھٹکتا ہو گا

کون تھا جس کے یہ سب شعلے ہیں
ہاں تو پہلے وہ سُلگتا ہو گا

ہاں یہی خشک ہوا کا جھونکا
ابر بن بن کے برستا ہو گا

ہاں یہی حرفِ دلآویز و عظیم
لبِ گویا کو ترستا ہوگا

ہاں یہی بحرِ سکوں کوہِ وقار
درد بن بن کے تڑپتا ہوگا

ایسے بیگانہ نہ سُننا لوگو!
یہ بھی افسانہ کسی کا ہوگا

کچھ جو آیا ہے ترے شعر میں ڈھنگ
یہ بھی ناصرؔ سے ہی سیکھا ہوگا

تو رہے چپ کہ غزلخواں عالیؔ
نہ بُرا ہوگا نہ اچھا ہوگا

سنہ ۱۹۶۷ء ————

○

یہ من جس پر سو سو کنواری کنوارپتا دے تول
اک سو خصمی ناگن اس کو مار گئی بے مول

ایک بہت ہی پیارے شہر میں اس نے بزم سجائی
کیسے کیسے جمے گھروں میں کیا کیا آگ لگائی

دل پھینکوں میں اس کے گھر کا کوہِ ندا تھا نام
بڑے بڑے کھنچ کھنچ کر پہنچیں اور آ جائیں کام

نئے نئے احوال سناتے سارے یار احباب
کوئی بتائے اس کو حقیقت کوئی بتائے خواب

جب ہم نے خود دیکھا اس کو ہوئے بہت حیران
پل بھر میں اک چھتیسی اور پل بھر میں نادان

نا وہ شاعر نا وہ گائک نا وہ گرنتھ کار
کوئی تو گن ہے جس پر یار و مٹ گئے سارے یار

دس دس مہماں پاس بٹھا کر سب سے آنکھ لڑائے
جس کا اس پر دل آجائے اُس سے دِل بھر جائے

ہم کو بھی پرکھا ہم سے بھی کھیلی نئے پُرانے کھیل
گھات کرے اُلجھنوں والی بات کرے بے میل

اِدھر ہمیں بھی اپنی صورت اور شہرت پر ناز
غالبؔ ہوئے بنا بھی رکھیں غالبؔ سے انداز

ہم یورپ اور امریکہ کی ناریوں کو رُلوائیں
ایک ترنم ایک تبسم کیا خاطر میں لائیں

آتے جاتے مِل لیتے تھے بے مطلب بے کار
پر وہ شام بھی آہی پہنچی جب وہ کر گئی وار

محفل پوری بھری ہوئی اور وہ بیٹھی تھی دُور
کوئی تھا اپنے داؤں گھات میں کوئی نشے میں چُور

اک دم سب کے سامنے اس نے کیا آواز لگائی
عاؔلی جی کیا بات ہے اب تک میں تم کو نا بھائی

پھر اک جھٹکا دے کر اُٹھی اور آ بیٹھی پاس
سانس میں گرمی آنکھ میں نرمی پیاس ہی پیاس ہی پیاس

کیا کہیے کیا پڑ گئی ہم پر ہم بھی ہیں انسان
جیسے چار طرف سے آ کر پھٹ جائیں طوفان

پیار کرے اور سسکی بھرے پھر سسکی بھر کر پیار
کیا جانے کب اک اک کر کے بھاگ گئے سب یار

پہلے کبھی نہیں گزری تھی جو گزری اس شام
سب کچھ بھول چکے تھے لیکن یاد رہا اک نام

ہاں وہ ایک ہی نام کہ جس سے پاپی من تھرائے
ہاں وہ ایک ہی نام جو ہر جنگل سے گھر لے آئے

۱۹۶۷ء

○

وہ مطمئن نہیں ہوتے اگر خدا کہیے
مگر خدا بھی نہ کہیے انہیں تو کیا کہیے

تمام رات خموشی کے بعد حکم ہُوا
کہ اب شکایت و مطلب جُدا جُدا کہیے

رکھی یہ شرط سرِ عام مہربانی کی
کہ آپ بھی تو ہمیں کچھ خفا خفا کہیے

کوئی پڑھے نہ پڑھے شکوۂ جفا لکھیے
کوئی سُنے نہ سُنے قصّۂ وفا کہیے

نزا یہ میرے گھر آنا کوئی نہ سمجھے گا
سوائے اس کے کہ اس کو بھی اک ادا کہیے

وسیلے اپنی جگہ پھر بھی جب وہ سامنے ہیں
جو آرزو ہے اسے ان سے برملا کہیے

یہ روز و شب جو سیہ کاریوں میں گزرے ہیں
انہیں بھی ردِ عمل ان سے عشق کا کہیے

یہ نادرستیِ افکار اور یہ عجزِ بیاں
اسے بھی ان کی توجہ کا مسئلا کہیے

بتا بھی دیجے کہ اب کج روی یہ چاہتی ہے
کہ خاکِ رہ کو بھی تیرا ہی نقشِ پا کہیے

سنا بھی دیجے کہ اب لوگ صاف پوچھتے ہیں
کہ عمر بھر کی تری گمرہی کو کیا کہیے

۱۹۶۷ء

بزمِ اقبالؔ کا مشاعرہ

عالیؔ کی باتیں مت سُننا گھاتیں اس کی لاکھ
بات کرے اقبالؔ کی لیکن اپنی بڑھائے ساکھ

جب بھی گیت خودی کے گائے بیچے ساتھ ضمیر
اپنے لیے آزادی چاہے سب کے لیے زنجیر

○

تجربہ ہر نفس ڈراتا ہے
دیکھیے کیا پیام آتا ہے

لوگ جب ساتھ ہوں تو وُہ ظالم
کس توجہ سے پیش آتا ہے

سارے نازک مقام جتلا کر
میری غزلیں مجھے سُناتا ہے

میرے پڑھنے کی نقل کرتا ہے
میری ہی طرح گنگناتا ہے

اپنے بارے میں جو بھی بات کرے
میرے دوہوں کا ذکر آتا ہے

ساری دنیا کہے کہ دونوں میں
کیا پُرانا اٹوٹ ناتا ہے

اس سے آگے یہ سلسلہ عالی
خواب کی طرح ٹوٹ جاتا ہے

۱۹۶۹ء ——————

غالبؔ کی صد سالہ برسی پر

میری بے حوصلگی اس سے سوا اور سہی
اور چاہو تو محبت کا صلا اور سہی

تیری ہر بات ادا ہے تو ادا اور سہی
اپنا شیوہ بھی گلا ہے تو گلا اور سہی

یوں بھی کچھ کم تو نہ تھے اتنی بہاروں کے ہجوم
ان میں شامل ترے دامن کی ہوا اور سہی

میں مُصر بھی ترے اظہارِ ندامت پہ نہیں
آج سے معنئ انداز و ادا اور سہی

کیوں نہ ہر شہر میں اس کے ہی قصیدے پڑھیے
وہ جو پہلے ہی خفا ہے وُہ خفا اور سہی

طلبِ درد میں دل حد سے گزرتا کب تھا
تم نے پوچھا تھا کہ اور اس نے کہا اور سہی

ہم اسی رحمت و زحمت کے ہیں عادی یارب
جیسی بھی ہے اسی دنیا کی فضا اور سہی

سبق بے گنہی تشنۂ تکمیل بھی ہے
اک نیا فلسفۂ جرم و سزا اور سہی

ہاں تو اس سال محاسن ہی ترے سن لیں گے
محفلِ تذکرۂ اہلِ وفا اور سہی

آج اک شور سہی کل تو کوئی پرکھے گا
ان صداؤں میں فقیروں کی نوا اور سہی

خود شناسی ہو، لگاوٹ ہو کہ بے مہری ہو
جس سبب سے بھی ترا عشق بڑھا اور سہی

کیا ضروری ہے کہ اندازِ بہاراں رکھے
اب جو کچھ اور ہے رفتارِ صبا اور سہی

صدیاں کہتی ہیں کہ بس دیر ہے اب قرنوں کی
اس قدر رنج سہا ہے تو ذرا اور سہی

سو برس بعد علائی نے غزل پھر لکھوائی
کم ہوا قرض تو خوب اور بڑھا اور سہی

اب بھی عالی کو کیا منع قدم بوس تو خیر
"ایک بیداد گر رنج فزا اور سہی"

فروری ۱۹۶۹ء

۲۳ مارچ سنہ ۱۹۶۹ء کا مشاعرہ

دھوئیں بھرے ہیں دلوں میں دماغ جلتے ہیں
چمن کے جسم پہ گل بن کے داغ جلتے ہیں

کوئی سبب کوئی اس کا علاج بھی ہو گا
کہ ہم بہار بساتے ہیں باغ جلتے ہیں

نہ بجھ سکا دلِ سوزاں جو آندھیوں میں تو آج
اس اک چراغ سے کیا کیا چراغ جلتے ہیں

کدھر گئے ہمیں یاں لا کے چھوڑنے والے
بجھی بجھی سی ہیں راہیں سُراغ جلتے ہیں

خانہ جنگی

اگر یہاں خانہ جنگی آئی تو کیا کرو گے
یہی کہ دو چار ہم خیالوں کے ساتھ وِہسکی پیا کرو گے
کلامِ اقبالؔ نثرِ لینن بیانِ غالبؔ پڑھا کرو گے
یہی کہ کوئی تمہیں پکارے تو معذرت کر دیا کرو گے
نہیں تو پھر اور کیا کرو گے

یہی کہ گھر کے جوان بچّوں کو رات دن گھر رکھا کرو گے
شریک ہوں گے جو خانہ جنگی میں اُن کی خبریں سُنا کرو گے
ضمیر کی ہر چُبھن پہ ایجاد اِک نیا فلسفہ کرو گے
نہیں تو پھر اور کیا کرو گے

یہی کہ تاریخ کے حوالے دیا کرو گے
یہی کہ امن اور آشتی کی دُعا کرو گے
یہی کہ اِک روزنامچہ لکھ لیا کرو گے
نہیں تو پھر اور کیا کرو گے

——— ۲۳ مارچ ۱۹۶۹ء

○

تازہ مانگیں ہیں فسانے ہم سے
جب ملیں دوست پُرانے ہم سے

کیوں چھپائے تھے یہ آلامِ سفر
تیرے نقشِ کفِ پا نے ہم سے

کیا بھروسا ہے کہ سب پوچھتے ہیں
تجھ سے ملنے کے بہانے ہم سے

ایک اک شعر پہ چھن جاتے ہیں
کتنے دردوں کے خزانے ہم سے

دردِ دل ٹھہر ذرا دیکھ انہیں
کون لایا ہے بلانے ہم سے

اب تو مانے ہو کہ اِس دَور میں بھی
مل ہی جاتے ہیں دِوانے ہم سے

ساری آوارہ مزاجی سِیکھی
تیرے کُوچے کی ہوا نے ہم سے

سارے اطوار دِل آویز لیے
تیرے انداز و ادا نے ہم سے

کبھی مانگا تھا یہی سوز و گداز
تیری آنکھوں کی فضا نے ہم سے

کبھی چاہا تھا یہی شورِ خموش
تیری صد لہجہ صدا نے ہم سے

آؤ گے یا ہمیں بلواؤ گے
پوچھتے ہیں وہ زمانے ہم سے

——— مئی ۱۹۷۰ء

○

اب حالیؔ جی اہلِ سخن کی صحبت سے گھبراتے ہیں
جب کہیں بیٹھنا ہی پڑ جائے گیت پُرانے گاتے ہیں

گیت پُرانے سوہنے لیکن کب تک گائے جاؤ گے
ایک سے بول اور ایک سی لَے سے کن رس بھی تھک جاتے ہیں

یہ سب شکوے سر آنکھوں پر لیکن یارو سوچو تو !
ایسے خوش گریانِ سخن کیوں چپ ہو کر رہ جاتے ہیں

کچھ تو ایسے جرم تھے جن کا رنج کچھ ایسا گہرا ہے
لوگ جتائیں یا نہ جتائیں یہ خود سے شرماتے ہیں

کچھ ناکام ارادوں نے بھی ہمت توڑ کے رکھ دی ہے
کچھ اپنی کم مائیگیوں کے خوف سے بھی گھبراتے ہیں

نوعمری میں عشق کی گلیاں اندھے پن سے مل نہ سکیں
اور اب جاتی عمر کے سائے کوسوں دُور بھگاتے ہیں

بے تقصیر وُہ جیون ساتھی ایسا ساتھ نبھاتی ہے
اس کو کوئی بھی دُکھ دینے کے دِھیان سے ہی تھراتے ہیں

اب بھی جو بھولے بھٹکے کوئی دعوتِ شوق آجاتی ہے
کیا کیا وعدے، کیا کیا وہم اور کیا کیا دھیان ستاتے ہیں

ایسی نیند بھی لے نہیں سکتے جس سے اٹھنا مشکل ہو
بھولے بھالے چاہنے والے بچّے روز جگاتے ہیں

جب سے چین میں گھوم آئے ہیں بے چینی سی رہتی ہے
کیا کچھ پایا کیا نہیں پایا کچھ بھی کہہ نہیں پاتے ہیں

جس دنیا کے خواب کتابوں اور قصّوں میں دیکھے تھے
وہ نہ ملی اور اب یہ سب کو پھر وُہی خواب دکھاتے ہیں

جون ۱۹۷۱ء

○

کیوں لکھ لکھ پتیاں پھاڑتے ہو
کیوں اپنے چمن اُجاڑتے ہو

کیوں دوہوں سے گھبراتے ہو
کیوں گیتوں سے شرماتے ہو
آنے بھی دو جیسے آتے ہیں
کچھ چھین تو لے نہیں جاتے ہیں
اچھے ہیں بُرے ہیں کیسے ہیں
جو کچھ بھی ہیں وہ تم جیسے ہیں

کچھ جڑے وقت کے پینے دو
ان بچوں کو بھی جینے دو
اب جو ان کا مستقبل ہو
تم خود کس بات میں کامل ہو

جون ۱۹۷۱ء

○

درِ رقیب سے اک موجۂ ہوا آیا
اور اِس میں خاص ترے جسم کا مزا آیا

تری قسم کہ سمجھ میں نہ آج تک اپنی
وصال و ہجر کا مطلب جُدا جُدا آیا

وہ کیا ہے کعبۂ دل میں کہ ڈھونڈنے جس کو
کبھی صنم، کبھی انساں، کبھی خدا آیا

کہیں نہ ہوتے دیا رنجِ گمرہی مجھ کو
کہاں کہاں مرے آگے وہ نقشِ پا آیا

چلا تھا سیر کو اپنا بھی شاہزادۂ دل
کہ راستے میں وہی باغِ پُرفضا آیا

عجیب کوہِ ندا تھا وُہ کوچۂ لاہور
ہر ایک شخص یہ کہتا ہُوا گیا آیا

ابھی سے حرفِ تمنا کی شرح و بسط نہ مانگ
ترس ترس کے تو کہنے کا حوصلا آیا

بدل گئے مرے مضموں غلط پیامی سے
سنا کہ تم نے سُنے اور عجب مزا آیا

کہا جو تو نے وہ ہم نے سنا بھی مانے بھی
بس اب نہ پُوچھ ہماری سمجھ میں کیا آیا

تمام بزم رہی ضبطِ داد سے بے حال
ارے یہ کس کی غزل تھی کہاں سُنا آیا

کس اضطراب میں تھا جب مرا پیام گیا
کہ وہ مری ہی زباں بولتا ہوا آیا

الٰہی اب یہ مری جاں لیے بغیر نہ جائے
یہ دردِ شعر جو اب تک گریزپا آیا

ہوا جو تیری بہار دل پہ شعر لے کر
طراوتِ چمن و خوبی ہوا آیا

کیا جو یاد تجھے اِک سُرور بن بن کر
روانی روش و مستی ادا آیا

رہیں جو تیرے لیے ان خموشیوں کا جواب
ہر ایک سمت سے ہو کر تری صدا آیا

یہ عشقِ میرؔ نہیں زندگی ہے غالبؔ کی
کہ ایک دل میں رہا اور دوسرا آیا

ترے ہزار جہت حوصلے بجا عالی
یہ دیکھ ذکر ترا تذکروں میں کیا آیا

جون ۱۹۷۰ء ___________

ڈوبتے سپنے ٹوٹتی کرنیں مدھم ہوتے ساز
پیرس اور لاہور میں سُنیے پت جھڑ کی آواز

۱۹۷۱ء

○

اب رات وہ گیت نہیں گاتی
اب رات وہ گیت نہیں گاتی

وہ جن سے خوشبو آتی تھی
اور رنگوں میں کھل جاتی تھی
پھر رنگ بدن بن جاتے تھے
اور ایسی آگ لگاتے تھے

جس آگ کی پیاس نہیں جاتی
اب رات وہ گیت نہیں گاتی

جاگی جاگی چنچل چنچل
سوئی سوئی کومل کومل
نا پنچم تھی نا مدھم تھی
ہر سر میں اک اپنا عالم تھی

ہر تان وہ سو سو بل کھاتی
اب رات وہ گیت نہیں گاتی

وہ پَون جھکورے متوالے
وہ اندھیارے وُہ اجیالے
وہ دُکھ ہی دُکھ کی لہریں سی
وہ سکھ ہی سکھ کی نہریں سی
وہ بے ہشیار اور مدماتی
اب رات وہ گیت نہیں گاتی

جب وہ نہ رہے ہم کو پیارے
سُر سوتے سوکھ گئے سارے
کیا کلجگ ہم کو لُوٹ گیا
گیت سے ناتا ٹوٹ گیا
گو اب بھی نیند نہیں آتی
اب رات وہ گیت نہیں گاتی

——— جون ۱۹۷۱ء

○

سنی سنائی سہی ایک ایک بات کہو
غزل کہو تو غزل میں معاملات کہو

نہ ہو جو تازگیٔ عشق کیا بگڑتا ہے
کلامِ میرؔ پڑھو اور واردات کہو

کہیں ملے نہ ملے ذوق و شوق کی دنیا
اساتذہ کی طرح سب لوازمات کہو

جو سدِّ راہ مسلسل رہے ہے عجزِ بیاں
تو کوئی قصۂ اسرارِ کائنات کہو

فقط زبان و بیاں پر ہے دسترس درکار
ستم کا بھی جو ہو مضموں تو التفات کہو

جب اپنی عمرِ سخن کی نہ ہو سکے امّید
تو جس نے جو بھی کہا اس کو بے ثبات کہو

۱۹۷۲ء

مشاعرہ، ۲۳ مارچ ۱۹۷۲ء

جگ کے پربت تولے اور پھر اتنے ہی پربت تولے
میرے مہا پاپوں کا پلڑا اپنی طرف ہی ڈولے

مالی اپنے خون سے سینچیں جس کی اک اک کیاری
روندنے والے روند رہے تھے وہ تازہ پھلواری

سوچتے جائیں سوچنے والے کیا پایا کیا کھویا
عالی جی کا گرو کبیرا دیکھ کبیرا رویا

اب مالی پھر سینچ رہے ہیں ایک نیا گلزار
اِس گلزار کو دھیان سے رکھنا جان سمجھنا یار

اس گلزار کو جان سمجھنا اس پر آنچ نہ آئے
پھر کوئی تجھ سا پھر کوئی مجھ سا اس کو روند نہ پائے

جب تک حکمِ محمدؐ پر اپنا ایمان رہے گا
پاکستان رہے گا ساتھی پاکستان رہے گا

۱۹۶۲ء

یومِ مئی

جیون بھر تو عالی جی نے پریم ترانے گائے
وقت کی لے بدلی تو یہ بھی گیت نئے لے آئے

جس کی گاڑھی کھری کمائی مفت میں تم نے کھائی
آج سے پہلے عالی جی تمہیں اس کی یاد نہ آئی

جیتے جیتے لہو کے دریا جس نے روز بہائے
عالی جی کبھی تم نے اس پر دو آنسو نہ گرائے

لوہے جیسے تن اور من سب بنتے جائیں راکھ
اور تم پتھر بن کر چاہو پارس جیسی ساکھ

چھایا مانگے اور پھل مانگے پنچھی سا مزدور
عالی تیری کویتا ایسی جیسے پیڑ کھجور

جس کی رنگت ہلدی جیسی جس کی جان عذاب
اس کو بھول کے تو نے عالیؔ سونگھے سُرخ گلاب

مورکھ اب بھی آنکھیں کھول اور دیکھ سمے کے کھیل
ٹوٹ رہی ہے سُوکھ رہی ہے ظلم کی اِک اِک بیل

او دیوار پُرانی ہٹ جا تیز ہے جنتا دھار
اب تیری بنسی نہیں بجے گی چلے گی اب تلوار

جھُوٹی مرتی جیسا بن کے نہ رہ اور جنتر منتر چھوڑ
مزدُور اور کسان سے مِل جا انھی سے ناتا جوڑ

ان سے ناتا جوڑ لے عالیؔ اور رکھیو یہ یاد
جھُوٹ نے اب تک کیسے کیسے کرے کیے برباد

عشق چھُپے اور مشک چھپے اور جوبن تک چھُپ جائے
سچا بول اور جھُوٹی کویتا کبھی نہ چھُپنے پائے

۱۹۷۲ء

○

پنّوں بن کب ستی ہُوئی اور رانجھا بن کب ہیر
کوئی تجھ پر کیوں ستی ہو جائے ستی تو مانگے ویر

چودہ علم کا جاننے والا تجھی سا راجہ بھوج
اِک تریا سے ہار گیا کیوں ہار گیا اب کھوج

مئی ۱۹۷۲ء

نا مجھے سورٹھا کہنا آیا نا دوہا نہ سوتیا
اپنی ہی مرج میں بہتی جائے بیری کو تا نیتا

مئی ۱۹۷۳ء

انقلاب آئے گا

زنگ خوردہ اک کردار
انتشار کی دیوار
آخری رکاوٹ ہے
یہ بھی ٹوٹ جائے گی
انقلاب آئے گا

ڈوب جانے والی ہیں
دولتیں امیروں کی
طاقتیں وزیروں کی
ان پہ چھانے والی ہیں
ستیاں فقیروں کی
انقلاب آئے گا

کھوکھلے نہ ہوں نعرے

تازہ خون آتا ہے

معنی و مطالب کے

رنگ ساتھ لاتا ہے

کوئی لمحہ جاتا ہے

وقت خود بتائے گا

اِنقلاب آئے گا

جون ۱۹۷۲ء

○

ترا سایا
میرے ہاتھ نہ آیا

من کے اندر من کے باہر
کیسے کیسے رُوپ دِکھا کر

کتنی دُور بھگایا
میرے ہاتھ نہ آیا
ترا سایا
میرے ہاتھ نہ آیا

صبحوں شاموں اور راتوں میں
کٹ گئی عمر انھی باتوں میں

سارا وقت گنوایا
میرے ہاتھ نہ آیا
ترا سایا
میرے ہاتھ نہ آیا

باغوں میں اور ویرانوں میں
خوابوں میں اور افسانوں میں

چھپ چھپ کر لہرایا
میرے ہاتھ نہ آیا
ترا سایا
میرے ہاتھ نہ آیا

گھر کیا کیا تیّار کیے تھے
کپڑے کیسے کیسے سیے تھے

دنیا بھر کو ہنسایا
میرے ہاتھ نہ آیا
ترا سایا
میرے ہاتھ نہ آیا

جولائی ۱۹۷۲ء

○

ہوئی امید کہ اب قیدِ فن سے اٹھتی ہے
اک آگ سی جو مرے تن بدن سے اٹھتی ہے

کہاں سے گزرے کسے پائمال کر جائے
بس ایک تند ہوا ہے دمن سے اٹھتی ہے

وہ میری لاش کے آثارِ زندگی دیکھو
لہو کی لہر ہے زخمِ کفن سے اٹھتی ہے

اگر بکھر نہ گئی محفلیں سجا دے گی
یہ انجمن جو تری انجمن سے اٹھتی ہے

عجیب رنگ کا طوفانِ باد ہے اس بار
تمام گردِ حصارِ چمن سے اٹھتی ہے

جولائی ۱۹۷۰ء

○

سُر ساگر پر پریم گھٹائیں
جو بوندیں برسائیں
سیپ تڑپ کر من میں بٹھائیں
وہ موتی بن جائیں
کوئی موتی اُس کی مُورت ہے
کوئی موتی میری صُورت ہے
کوئی موتی آس کی رنگت ہے
کوئی موتی امن کی سنگت ہے
سب موتی اک دُوجے سے الگ ـــــ
پر ایک ہی لے میں گائیں
سر ساگر پر پریم گھٹائیں
جو بوندیں برسائیں

جو کوئی اس لے کو سنتا ہے
وہ مستی میں سر دھنتا ہے
سب مطلب اس کے چنتا ہے
اور پیار کے سپنے بنتا ہے

سب سن لیں اور سب سپنے بنیں —
تو دن سب کے پھر جائیں
سُر ساگر پر پریم گھٹائیں
جو بوندیں برسائیں

جولائی ۱۹۴۳ء

○

اس وقت سے میں ڈرتا ہوں
جب وقت سے میں ڈر جاؤں

کیا جانیے کیا دکھلائے گا
کس کس سے کیا سنوائے گا
میں اب تک وقت سے کھیلا ہوں
میں وقت ہی سا البیلا ہوں

میں کیوں اس کے سر جاؤں
ہاں ہاں
کیوں اِس کے سر جاؤں
اس وقت سے میں ڈرتا ہوں
جب وقت سے میں ڈر جاؤں

ہاں آنسو بن کر رہتا ہوں
اور سب آنکھوں سے کہتا ہوں
وہ لمحہ جلد ہی آئے گا
جو ساتھ مجھے لے جائے گا

بو میں تم کو بجھ جاؤں

ہاں ہاں

بیں تم کو بجھ جاؤں

اس وقت سے بیں ڈرتا ہوں

جب وقت سے میں ڈر جاؤں

جولائی ۱۹۶۳ء

نذرِ امیر خسروؒ

کچھ جگمگ جگمگ ہوت ہے
کوئی اوڑھے چنریا سوت ہے

کن سازوں کی آوازیں ہیں
جو دل کو مستی جاتی ہیں
کن یادوں کی کیا شمعیں ہیں
جو رُوح میں جلتی جاتی ہیں

یہ کیا سرگم کیا سنگت ہے

کچھ جگمگ جگمگ ہوت ہے
کوئی اوڑھے چنریا سوت ہے

جیون تو تیرے سنگ کٹا
کیا تیرے بنا جینے کا مزا
او سونے والے تو نہ اُٹھا
تو عالی بھی سو جائے گا

یہ خسرو جیسی الفت ہے

کچھ جگمگ جگمگ ہووت ہے
کوئی اوڑھے چنریا سووت ہے

مارچ ۱۹۷۴ء

○

بیماروں کو شک ہے تو مٹا کیوں نہیں دیتے
جو لوگ مسیحا ہیں شفا کیوں نہیں دیتے

بستر سے ترے دور جو آتا ہے مجھے لطف
وہ لطف یہ انداز و ادا کیوں نہیں دیتے

کتنے فلک اس اخترِ گم گشتہ کو ڈھونڈاں
تھوڑی سی مدد دل کے خلا کیوں نہیں دیتے

اس بار جو آیا ہوں ترے کوچۂ جاناں
تیرے در و دیوار صدا کیوں نہیں دیتے

ہنستے ہو جو ہر لمحہ مرے قتلِ انا پر
لوگو! مجھے مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

صدیاں تو گئیں معرکۂ عقل و جنوں میں
جو بات بتانی ہے بتا کیوں نہیں دیتے

مدت سے جو یہ ترکِ حضوری کی طلب ہے
تم مجھ کو مرے گھر کا پتہ کیوں نہیں دیتے

معدوم کیا جاؤں گا اس وعدے پہ جل کر
میں خاک ہوا مجھ کو اڑا کیوں نہیں دیتے

خیر اور تو سب مدعیِ بے گنہی ہیں
حیرت ہے کہ تم ہم کو سزا کیوں نہیں دیتے

چاہت نہ تھی سرمایہ، نہ ہم نفع کے قائل
محنت تھی سو محنت کا صلا کیوں نہیں دیتے

ناقابلِ درماں ہوں ازل سے تو ابد تک
اک گوشۂ دامن میں چھپا کیوں نہیں دیتے

اس شام کے بعد آج تلک مجھ کو بھلانا
ممکن تھا تو وہ مجھ کو بھلا کیوں نہیں دیتے

ہاں تُو تو ملا کرتی ہے تو کہہ کہ وہ ہم کو
اپنی خبر اے بادِ صبا کیوں نہیں دیتے

کیوں دوست عدالت کی طرح سنتے ہیں شکوے
حضرت ہمیں آپس میں ملا کیوں نہیں دیتے

عاشق ہیں مگر کہیے تو شاگرد بھی ہو جائیں
کچھ اپنے ہُنر ہم کو سِکھا کیوں نہیں دیتے

کیوں ظلمتِ ابہام ہو تقدیر ہماری
تم ایک جھلک سب کو دکھا کیوں نہیں دیتے

ثابت تو رہے خوبی و تقصیر ہماری
تم کھل کے جزا اور سزا کیوں نہیں دیتے

اب چُپ ہے مگر کل تو یہ رُوداد کہے گا
اس شخص کو محفل سے اٹھا کیوں نہیں دیتے

—————— اپریل ۱۹۷۳ء

○

کھلتی کلیوں کی بے صدا جیسے
جو نہ آیا تھا آ گیا جیسے

پھیلتی جا رہی ہیں خوشبوئیں
آئی ہے عشق کی ہوا جیسے

جھلملانے لگی ہیں روشنیاں
مطلعِ فکر کھل گیا جیسے

ذہن اور جسم کا یہ عالم ہے
کوچۂ یار کی فضا جیسے

لال پھولوں میں سج گئی دیوار
اپنا گھر اُس کا گھر ہوا جیسے

ہم کہ مُرجھا رہے تھے تازہ ہوئے
رنگ و خوشبو میں موتیا جیسے

کوئی شکوہ نہیں بیاں کے لیے
وہی کرتا رہا وفا جیسے

نہ رہی انتظار کی بھی تھکن
چھوڑ کر ہی گیا نہ تھا جیسے

میرے شعروں میں رہتے ہیں تجھ بن
سارے مصرعے جُدا جُدا جیسے

ہے ترے ساتھ مدوجزرِ غزل
چاند سُورج کا ماجرا جیسے

جاگ اُٹھی ہے رات کی رانی
آئے گا اب وہی مزا جیسے

اِک برس کا شدید زخمِ فراق
ایک لمحے میں بھر گیا جیسے

آج بندوں سے بھی جو ڈرتے ہیں
کبھی لگتے تھے وُہ خدا جیسے

اپریل ۱۹۰۳ء

ایمن

یہ ساز نہیں
آواز نہیں

یہ من وینا کا جھالا ہے
اس کا ہر رُوپ نرالا ہے
یہ ساز نہیں . . .

خود ٹھاٹھ ہے خود ہی سرگم ہے
جھن جھنن جھنن ، جھن جھنن جھنن
تنہا تنہا ، پھیلا پھیلا
دُھندلا دُھندلا ، روشن روشن

خود چندا ہے، خود ہالا ہے
یہ ساز نہیں
آواز نہیں

یہ من وینا کا جھالا ہے
اس کا ہر روپ نرالا ہے
یہ ساز نہیں . . .

دھا دِھن دِھن دھا ، دھا دِھن دِھن دھا
کوئی بندش کوئی تال کہے
سب گائک درپن میں اُلجھے
کوئی اندر کا بھی حال کہے

کیوں پردے میں من مالا ہے
یہ ساز نہیں
آواز نہیں
یہ من وینا کا جھالا ہے
اس کا ہر روپ نرالا ہے
یہ ساز نہیں . . .

سب تان پلٹ، سب گت سنگت
کیوں پیار کی دُھن پر چلتے ہیں
کیوں غالی جی کے گیتوں میں
سُر اگنی بن کر جلتے ہیں

کیا کوئی سمجھنے والا ہے
یہ ساز نہیں

اپریل ۱۹۰۳ء

اچھائی اور سچائی اور سُندرتا ہیں ایک

جو سچا ہے وہ سُندر ہے جو سُندر وہ نیک

ستمبر ۱۹۰۳ء

کتنے مہاکویوں کی کویتا جن کے پیچھے بڑے سدھائے
بوگن ویلیا کی بیلیں جن میں خوشبو کبھی نہ آئے

سنہ ۱۹۷۳ء

آنکھوں کا عطیہ رجسٹر کرانے پر

جب میری آنکھیں تیرے لگیں گی
دیکھنے والے کیا دیکھے گا
کیا دیکھے گا

یہ کہ اشارے کیا ہوتے ہیں
یہ کہ نظارے کیا ہوتے ہیں
دن کا مطلب کیا ہوتا ہے
رات کا منصب کیا ہوتا ہے
مائیں، بہنیں، بچے، پیارے
پھول، پرندے، جگنو، تارے

بس اتنا روشن پہلو ہے
باقی سب دنیا بدرو ہے
آگے جو بھی ہو مری حد تک یہ ساری دنیا بدرو ہے

ایسے ایسے لوگ کمینے
جو نہ شریفوں کو دیں جینے
ان کے چہرے ان کا تبسّم
اور ان کا اندازِ تکلّم

دوزخ جیسا اک منظر ہے
دیکھنے والے سچ کہتا ہوں تاریکی ان کے نظارے سے بہتر ہے

مجھ کو دعائے بد مت دینا
میں نے تجھ کو آنکھیں کیوں دیں
میں جذباتی ہوں، شاعر ہوں

میں نے سنا تھا پاکستان میں لنکا سے آنکھیں آتی ہیں
اور ہماری اپنی آنکھیں یونہی قبروں میں جاتی ہیں
میں نے پاکستان کو پاکستان کی آنکھیں دینی چاہیں
میں نے کیا کیا بول سنے

اور اچھے اچھے دوستوں نے بھی طنز کیے
پھر بھی میں نے پاکستان کو پاکستان کی آنکھیں دینی چاہیں
پاکستانی چاہیں تو یہ آنکھیں لے لیں گے
ورنہ انھیں بھی میرے ساتھ دفن ہونا ہے
کوئی کہہ نہیں سکتا یہ سب کیا ہے کیا ہونا ہے

کوئی شکار، اور کوئی شکاری

اِنسانوں کی ناہمواری

بھوک غریبی اور بیماری

سوچنے والوں کی لاچاری

دُکھ بن دُکھ کی بپتا ساری

نیک دِلوں کی اہلِ تعصب شیطانوں میں دل آزاری

ناہمواری اور بیماری اور لاچاری

خود دیکھے کا بپتا ساری

جب دیکھے تو مجھ کو دعائے بدمست دینا

میں نے تجھ کو آنکھیں کیوں دیں

میں جذباتی ہوں، شاعر ہوں

ہاں جو تجھے وہ عصر ملے

جب روشنیوں کو دیکھ سکے

اے آنکھوں والے لازم ہے تو میرے اندھیرے یاد کرے

اور میرے لیے دو چار نہیں تو ایک ہی اچھا لفظ کہے

گو اب ایسا دستور نہیں

اچھا سننا اچھا کہنا

ہم لوگوں کو منظور نہیں

جب روشنیوں کی سیر ملے
مجھ کو بھی دعائے خیر ملے
کچھ میری روح بھی یوں سوچے
میں نے تو نہیں دیکھے لیکن
ان آنکھوں نے وہ منظر دیکھ لیے
جن میں انسان انسان ہوئے
سب پورے ہو نہ سکے پھر بھی
پورے کچھ تو ارمان ہوئے
انسان کسی منزل میں تو انسان ہوئے

جب روشنیوں کی سیر ملے
مجھ کو بھی دعائے خیر ملے
اور دیکھنے والے یاد رہے مرے جیتے جی
ان آنکھوں کو کوئی منظر اپنا نہیں ملا
سب غیر ملے
جب روشنیوں کی سیر ملے
مجھ کو بھی دعائے خیر ملے

۱۹۷۳ء

گرج گرج کر گھنٹے گھڑیاں روز مجھے دھمکائیں
جاتے دن رو رو رخصت ہوں آتے دن سہمائیں

جون ۱۹۷۳ء

○

ذرا بھی چھُو لو تو اُڑ جاؤں کہکشاں کی طرح
پڑا ہُوا ہوں میں اک تیر بے کماں کی طرح

یہ فاصلے بھی افق سے زیادہ دُور نہیں
زمیں پر اُتر آؤ گے آسماں کی طرح

ہزار نام جو اب یاد بھی نہیں آتے
چمک رہے تھے کبھی نقشِ جاوداں کی طرح

غبی نہ جان جو چپ ہیں کہ ہم بھی ہوتے تھے
کبھی شرار کبھی گُل تری زباں کی طرح

جُدا ہوئے بھی تو دونوں کی راکھ چمکے گی
سُلگ چکی ہے تری روح میری جاں کی طرح

پہنچ کے منزلِ جاناں پہ ہم بکھر سے گئے
کسی تھکے ہوئے سالارِ کارواں کی طرح

وہ اب بھی ہم کو بٹھاتے ہیں اپنی محفل میں
مگر بس ایک پُرانے فسانہ خواں کی طرح

طلب زیادہ رسد کم معیشت دِل میں
خموشیوں کی بھی قیمت لگی فغاں کی طرح

ثواب کا بھی وسیلہ ہے صحبتِ نا جنس
تمام وقت گذرتا ہے امتحاں کی طرح

میں ایک جان ہوں کب تک ہزار سمت کھنچوں
اب آئے موت گلے سے لگائے ماں کی طرح

یہ کم نہیں کہ میں جیتا ہوں اس طرح جس سے
ہر ایک لطف اٹھاتا ہے داستاں کی طرح

دسمبر ۱۹۷۳ء

کوئی پتی اور کوئی پتا کوئی بیٹا اور کوئی بھائی
اے لوگو! اک نار پہ تم نے کیا کیا قید لگائی

دسمبر ۱۹۰۳ء

غنائیہ

کتنے دن سے
سلام خاک کو
اک خواب کی تعبیر
جھنانن جھنن

مارچ ۱۹۷۴ء

۱

کتنے دن سے چاند ستارے انسانوں کو دیکھ رہے ہیں
انسانوں کے خوابوں کو اور ارمانوں کو دیکھ رہے ہیں
اندھیاروں پر روشنیوں کا ہلکے ہلکے چھا جانا
مظلوموں کا رفتہ رفتہ ظلم پہ غالب آجانا
خوابوں کو اور ارمانوں کو
چاند ستارے انسانوں کو
دیکھ رہے ہیں
دیکھ رہے ہیں
ایک سفر ہے
شام و سحر ہے
ایک سفر ہے جس کی منزل آپ سفر ہے
ایک سفر ہے جس کا مطلب راہ گزر ہے

۲

سلام خاک کو اور خاک کے دفینوں کو
سلام اس کے ابلتے ہوئے خزینوں کو

اسی میں چشمۂ نورِ حیات ملتا ہے
یہیں جمالِ رُخِ کائنات ملتا ہے

ہزار نام بدل کر ہر اک فسانے میں
اسی کے رنگ اجاگر رہے زمانے میں

بدن میں رُوح کی شورش سنبھالنے والی
ہماری ماں ہے زمیں ہم کو پالنے والی

ہر اک وجود کو سیلِ زماں بہاتا ہے
مگر زمین سے ٹکرا کے لوٹ جاتا ہے

فلک بلند ستاروں کے پاسبانوں میں
زمین پھیلی ہوئی ہے غریب خانوں میں

سلام تجھ کو کہ بس تو قدیم بعدِ خُدا
سلام تجھ کو کہ بس تو عظیم بعدِ خُدا

یہ اشعار ۱۹۴۹ء کے ہیں

(۳)

پھر شوقِ عمل فکر کا ہمراز ہوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے

اے صیدِ زبوں تیرے لیے گھوم رہی ہیں
آزاد فضائیں

اے جذبِ جنوں تیرے لیے جھوم رہی ہیں
یہ تازہ ہوائیں

پھر سوزِ دروں زمزمہ پرواز ہوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے

کچھ روشنیاں صاف نظر آنے لگی ہیں
لہرانے لگی ہیں

کچھ آرزوئیں حسنِ بیاں پانے لگی ہیں
بر آنے لگی ہیں

پھر عشق کا موسم اثر انداز ہوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے

اے ہم سفرو فکر و عمل کے یہ خزانے
بخشے ہیں خدا نے

اے ہم سخنو گاؤ نئے زندہ ترانے
کیا راگ پرانے

پھر سارا جہاں گوش بر آواز ہوا ہے
اک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا ہے

(۴)

تال روپک

مستقبل میں جھانک کے دیکھو کیا کیا امکاں رقصاں ہیں
کیا کیا خواب ہوئے ہیں پورے کیا کیا ارماں رقصاں ہیں
جھنا نن جھنن جھنا نن جھنن
جھنا نن جھنن جھنا نن جھنن
نئے ساز ہیں نئے گیت ہیں نئے میت ہیں نئی انجمن
جھنا نن جھنن جھنا نن جھنن

〃 〃 〃 〃

جو گزر گیا اسے یاد کر مگر اس طرف بھی تو کر نظر
یہ تجلیاں در و بام پر یہ گل و گلاب چمن چمن
جھنا نن جھنن جھنا نن جھنن

〃 〃 〃 〃

وہ ستم زدوں کی رفاقتیں وہ ہم اہلِ دل کی انائیتیں
وہی بن رہی ہیں صداقتیں وہی جلوہ گر ہیں کرن کرن
جھنا نن جھنن جھنا نن جھنن

" " " "

یہ جو ارتقا کا سرور ہے یہ جو کشمکش کا شعور ہے
یہی انقلاب کا نور ہے یہی انقلاب کا پیرہن
جھنا نن جھنن جھنا نن جھنن

" " " "

نئے ساز ہیں نئے گیت ہیں نئے میت ہیں نئی انجمن
جھنا نن جھنن جھنا نن جھنن

" " " "

اے خدا

میں نے دیوارِ کعبہ سے اک دم چمٹ کر کہا
اے خدا
اے خدا
اے خدا
اور پھر کچھ نہیں کہہ سکا

اپریل ۱۹۷۴ء

بھیرویں

وہ سدا سہاگن راگنی
وہ آٹھ پہر کی بھور
جب گائے کوئی گانے والا
جگ ناچے بن کر مور
وہ سدا سہاگن راگنی

کھرج، رکھب، گندھار اور مدّھم
پنچم، دھیوت اور نکھاد
چار سُروں سے سرگم ابھرے
تین سے ابھرے داد
وہ سدا سہاگن راگنی

لمبے لمبے بالوں میں پھندے
کلیوں سے بھرپور
کندھوں پر ہے سانپ لپیٹے
آنکھیں ٹھاٹھ سے چُور
وہ سدا سہاگن راگنی

مدُھر مدُھر اور کومل تیور
اس نغمے کی ساکھ
خسرو پر جو جلیں پتنگے
عالیؔ ان کی راکھ
وہ سدا سہاگن راگنی

۱۹۷۵ء

○

تو کیا وہ ہم کو ہر اِک جُرم کی سزا دے گا
پھر اپنے رحم و کرم کا ثبوت کیا دے گا

میں روزِ حشر کا قائل ہوں پھر بھی ہنستا ہوں
کہ ایک بندہ خدا کو حساب کیا دے گا !

ہمیں تمہاری طرح شیخ علمِ غیب نہیں
نہ جانے کون عمل کس کو بخشوا دے گا

بس ایک شعلہ جلا دوں کسی صداقت کا
زمانہ آپ ہی صدیوں تلک ہوا دے گا

مطلعِ ثانی
یہ لذّتیں وہ یہ سب شدّتیں بھلا دے گا
کبھی خیال ہی آیا تو مسکرا دے گا

بہت گناہ کیے ہیں مگر گماں بھی نہ تھا
کہ وقت مجھ کو ترے عشق کی سزا دے گا

کیا کسی نے جو بدنام اسے تو کیا پروا
اب اس کا نام ہزاروں کے سر جھکا دے گا

یہ احتیاط یہ ڈر یہ انا کے سو بیچاک
اگر ہے عشق تو پھر عشق سب ہٹا دے گا

ہم ایک ہیں متوازی خطوط ہو کر بھی
جدا کیا ہے ازل نے ابد ملا دے گا

۱۹۷۵ء

جل جاؤ گے یہاں نہ کہنا جھوٹ کوئی احوال
یہ شہرِ اقبالؔ ہے عالیؔ، یہ شہرِ اقبال

سارے ملک میں گھوم رہے ہو کیا کیا ڈھونگ رچائے
کوئی تو ایسا شہر ہو جس کی مٹی سچ بلوائے

ہاں مرے بابا ہاں مرے مرشد میں تجھ پر قربان
تو نے بنایا میں نے بگاڑا تیرا پاکستان

نومبر ۱۹۷۷ء

بحرانیات

(۱)

خدائے قدوس
یہ وطن، ہم کو تیرا تحفہ ہے
تیرا انعام
تیرا پیغام
اور تیری عظیم امانت ہے
جس میں، ہم بارہا خیانت بھی کر چکے ہیں
مگر ترے ہی کرم سے اب تک
اسے امانت بھی رکھ رہے ہیں
خدائے قدوس تیرا تحفہ
گناہ گاروں کے حق میں اک امتحان بھی ہے
جو آج کل سخت ہو گیا ہے
ہم اپنے اپنے ضمیر کی روشنی میں
اس سے گزر رہے ہیں
ترا یہ حق ہے کہ جب بھی چاہے
ہمیں کسی امتحاں میں ڈالے
مگر ہمیں بھی دُعا کا حق ہے

کہ تو ہمیں اپنے دامنِ عفو میں چھپا لے
کہ تو ہی گرتے ہوؤں کو اک بار پھر سنبھالے
دلوں سے نفرت کو دور کر دے
جو زہر بن کر ہماری روحوں میں رچ گئی ہے
کہ درتوں کو محبتوں کی پناہ دے دے
کہ درتیں ہم کو کھا رہی ہیں
محبتیں دور جا رہی ہیں
کہ درتوں کو محبتوں کی پناہ دے دے
خشونتوں کو محبتوں کی نگاہ دے دے
کہ ہم ترے اس عظیم تحفے کی روشنی پھر سے دیکھ پائیں
کہ ہم تو جیسے ہیں صرف بندے ہیں
تو خدا ہے
کہ ہم تو بندے ہیں
تو خدا ہے

اپریل ۱۹۷۷ء

بحرانیات

(۲)

میں سب کے ساتھ ایک کرب میں مبتلا ہوں
اور بے بسی کے زنداں میں قید، تنہا، تڑپ رہا ہوں
جو باعمل ہیں وہ کچھ تو کرتے ہیں
اپنے اپنے خیال کی رہنمائیوں میں
کبھی وہ سَر کرتے ہیں ارادوں کی چوٹیاں
اور کبھی وہ گرتے ہیں کھائیوں میں
مگر میں چل کر ٹھہر گیا ہوں
کوئی اگر یہ بھی کہہ رہا ہو تو اس سے حجت نہیں کروں گا
کہ ڈر گیا ہوں
مگر یہ وہ کہتے اچھے لگتے ہیں جو چلے بھی ہوں
اور نہ اٹکے ہوں
اور نہ بھٹکے ہوں
اور سچائیوں کی جانب رواں دواں ہوں
(الٰہی سچائیوں کے مفہوم تو فقط تو ہی جانتا ہے
مگر ہر اہلِ ضمیر آخر کوئی تو سچائی مانتا ہے)
یہ تبصرہ باز محفلیں

اور یہ آگ پر ہاتھ تاپنے والے سارے بقراط
سرد کمروں میں دودھ اور شہد پینے والے تمام سقراط
جنھوں نے اب تک کسی بھی جانب کوئی قدم ہی نہیں اٹھایا!
وہ جن کے اپنے لہو کا اک قطرہ بھی
خدا اور اس کی مخلوق کے کسی کام ہی نہ آیا
وہ مجھ پہ تنقید کیا کریں گے
کسی کی تردید پر ہی سینہ سپر نہیں ہیں
وہ حق کی تائید کیا کریں گے
سب اپنی آرام دہ نشستوں پہ منصفِ حق بنے ہوئے ہیں
میں تپ رہا ہوں
میں جل رہا ہوں
پگھل رہا ہوں

مئی ۱۹۷۷ء

بحرانیات

(۳)

سبھی بچوں کا حق ہے
فرض بھی ہے
اور ان پر قرض بھی ہے
اپنی ماؤں کے پاؤں چھونا
اس کی خدمت اپنے اپنے طور پر کرنا
اگر اس کی محبت میں
اطاعت میں
کوئی رن بھی پڑے تو اس کو سر کرنا
نہیں اپنی اَنا مجروح ہو تو ماں کی خاطر درگزر کرنا
مگر وہ کیسی خدمت ہوگی
جس میں ماں کے پاؤں زخم کھا جائیں
انھیں چوما تو جاتا ہے
انھیں روندا نہیں جاتا
کہ ماں تو ماں ہے
وہ عورت نہیں جس کے لئے جنگ رقابت ہو
کبھی ماں کے لئے بچے سوئمبر میں نہیں جاتے
وہ اس کے پیار میں اک دوسرے سے آگے بڑھ جائیں

مگر اس دوڑ میں

نفرت، عداوت اور اَنا کے بَدنما پرچم نہ لہرائیں

محبت کی گزرگاہوں کا ہر لمحہ

محبت کی امانت ہے

ارے لوگو!

فقط ماں کی طرف دیکھو

اگر ماں سے محبت ہے ——————

مئی ۱۹۷۷ء

پریم کی شکتی بہت بڑی اور جگ بھر سے ٹکرائے
سمے کی دیمک چپکے چپکے اس کو بھی کھا جائے

۱۹۷۸ء

○

اگلی ہی گلی میں رہتا ہے اور ملنے تک نہیں آتا ہے
کہتا ہے تکلّف کیا کرنا ہم تم ہیں تو پیار کا ناتا ہے

کہتا ہے زیادہ ملنے سے وعدوں کی خلش بڑھ جائے گی
کچھ باتیں وقت پہ بھی چھوڑو، دیکھو وہ کیا دکھلاتا ہے

کہتا ہے تمہارا دوش نہ تھا کچھ ہم کو بھی اپنا ہوش نہ تھا
پھر ہنستا ہے پھر روتا ہے پھر چپ ہو کر رہ جاتا ہے

خود اس سے کہا گھر آنے کو اور اس کے بنا مر جانے کو
اور اب جو وہ کچھ آمادہ ہوا جی رہ رہ کر گھبراتا ہے

اے بچو! اے ہنسنے والو تاریخِ محبت پڑھ ڈالو
دل والوں کے دل پر قید نہیں ہر عمر میں ٹھوکر کھاتا ہے

۱۹۷۸ء

○

یہ عشق کی گلیاں جن میں، ہم کس کس عالم میں آئے گئے
کہتی ہیں کہ حضرت اب کیسے تم آج یہاں کیوں پائے گئے

اک شرط ہے یاں خوشبوئے وفا یاد آئے تو کرنا یاد ذرا
جب تم پہ بھرد ساتھا گُل کا کیا مہکے کیا مہکائے گئے

ہے یہ وہی لوحِ بابِ جنوں لکھا ہے نہ پوچھو کیا اور کیوں!
تم لائے کلیدِ جذبِ دردِ دل اور سب منظر دکھلائے گئے

اک تختِ روانِ شعر آیا کچھ شاہِ سخن نے فرمایا
پھر تاجِ ترنم پہنایا اور غزلوں میں ٹکوائے گئے

اک طبعِ رسا سے کیا بنتا یہ اُن گلیوں کا صدقہ تھا
وہ لفظ اور وہ اسلوب ملے اور وہ معنی سجوائے گئے

حیرت سے ٹھہر جاتی تھی یہاں یہ کہتی ہوئی ہر کاہکشاں
جب یوں ہی مل جانا ممکن ہے تو پھر ہم کیوں پھیلائے گئے

کیا سنگِ ملامت آتا تھا کیا سر اونچا ہو جاتا تھا
اک چھوٹے سے دورِ جرأت میں بسیار لقب دلوائے گئے

کیا شرم تھی جیب و گریباں پر اور جوں ہی نہ رکھی اپنی خبر
ہر چاک کے آگے گن گن کر سو سو دامن پھیلائے گئے

دنیا کے بھی انداز بہت ان گلیوں کے بھی ہیں راز بہت
جو ٹھہرے وہ سرافراز ہوئے جو نکلے وہ ٹھکرائے گئے

۱۹۷۹ء

○
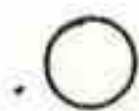
جب سے یہ خامشی ہماری ہے
عشق سب کی اجارہ داری ہے

شعر گوئی پسند فرمائی
جیسے مضمونِ اختیاری ہے

جب بھی جو بات دھیان میں آئی
ابدیت کی راہ داری ہے

کوئی لفظوں کی آبرو لوٹے
کوئی محوِ غزل شماری ہے

روندتے پھر رہے کوئے جاناں کو
اور کہتے گلی ہماری ہے

رکھ کے مرہم کہا کہ خشک ہُوا
یہ نہ دیکھا کہ زخم کاری ہے

شکوہ سنجانِ دورِ بہمن و دَے
لو یہ کیفیتِ بہاری ہے

کیسے کیسے نشے ہیں مستحسن
صِرف ممنوع مے گُساری ہے

اے سخن سُرمہ در گلو ہو جا
لبِ شاہاں پہ نغمہ باری ہے

ایک عالم ہوا ہے پنبہ بہ گوش
یہی تقدیرِ آہ و زاری ہے

کوئی وعدہ وہ کر جو پورا ہو
کوئی سکّہ وہ دے کہ جاری ہے

اے سحر جلد ہو طلوع کہ اب
چشمِ مردم میں رات بھاری ہے

بجھ تو جائیں گے یہ شرار مگر
دور تک ان کی تاب کاری ہے

۱۹۷۹ء

○

یہ جو بڑھتی ہوئی جدائی ہے
شاید آغازِ بے وفائی ہے

تو نہ بدنام ہو اسی خاطر
ساری دنیا سے آشنائی ہے

کس قدر کشمکش کے بعد کھلا
عشق ہی عشق سے رہائی ہے

مرحبا جوئے خونِ اشک رواں
کتنے صحرا گزر کے آئی ہے

شامِ غم ! میں تو چاند ہوں اُس کا
میرے گھر کیا سمجھ کے آئی ہے

زخمِ دل بے حجاب ہو کے اُبھر
کوئی تقریبِ رُو نمائی ہے

اٹھتا جاتا ہے حوصلوں کا بھرم
اک سہارا شکستہ پائی ہے!

تجھ پہ بے اعتباریوں کا سبب
تیرے دعووں کی پارسائی ہے

جانِ عالیؔ نہیں پڑی آساں!
موت رو رو کے مسکرائی ہے
———— ۱۹۷۹ء

گاؤں کے لوگ نہیں پہچانے، چپ ہے ساہوکار
ارے ترے دوہوں کی گٹھری رہ گئی ہے اس پار

جاننے والے دکھ سے چپ تھے پر بچے چلّائے
عالی جی تم کویتا جی کو کس رَن میں چھوڑ آئے

عالی ڈوبا، ڈوبنا ہی تھا، رکھے بوجھ ہزار
ایک ذرا سی کشتی کتنے بوجھ اٹھاتی یار!

عالی خود ہی خاک اڑائے اور خود شور مچائے
دیکھو لوگو میں کیا دیکھوں کچھ بھی نظر نہ آئے

لوٹ گئے ترے کھیل کھلونے چھِن گئے تیرے پھول
عالی مت اب واپس آنا لوگ سمجھے گئے بھول
۱۹۸۰ء

○

لوگ کرتے ہیں تماشا مری رسوائی کا
نام ہوتا ہے تری انجمن آرائی کا

ہاں بُلا لو مگر الزام نہ دینا کہ ابھی
کام باقی ہے بہت بادیہ پیمائی کا

ہم بھی کچھ تجزیۂ شوق میں کوشاں ہوں مگر
تجھ سے چھٹ کر کوئی عالم نہیں تنہائی کا

کیا زمانے تھے کہ جب موسمِ گل آتے تھے
ذکر چلتا تھا ہمیشہ کسی سودائی کا

کیا فسانے تھے کہ صدیوں تلک آجاتے تھے
ان میں کچھ سحر تو ہوتا تھا پذیرائی کا

خود ہوا عشق دہکتے ہوئے سورج کی طرح
کون اب چاند نکالے تری زیبائی کا

اب بھی اُس کو مرضِ وعدہ فراموشی ہے
اور ہر دم وہی دعویٰ ہے مسیحائی کا

آج بھی تیرے سوا تیرے سوا تیرے سوا
کوئی مضموں ہی نہیں قافیہ پیمائی کا

دل ہمیشہ وہی مانگے ہے جو اُس پاس نہ ہو
مسئلہ کچھ نہ تمنا نہ تمنائی کا

مدتوں میں یہ غزل آئی، یہ سچ ہے لیکن
اس میں اعلان بھی ہے مرگِ شکیبائی کا

۱۹۸۱ء

اس کو کچھ نہیں ملتا جس نے ہاتھ نہیں پھیلائے
یہ سچ ہے اور یہ بھی سچ ہے جانے کیا مل جائے
۱۹۸۱ء

○

عالیؔ جس کا فنِ سخن میں ایک انداز نرالا تھا
نقدِ سخن میں ذکر یہ آیا دوہے پڑھنے والا تھا

چند نئے شعروں کے شعلے کیسی لَے میں بھڑکتے تھے
تم آکر سنتے تو سہی کل ساری رات اُجالا تھا

جانے کیوں لوگوں کی نظریں تجھ تک پہنچیں، ہم نے تو
برسوں بعد غزل کی رَو میں اک مضمون نکالا تھا

کیا وہ گھٹا ترے گھر سے اٹھی، کیا وہ تو نے بھیجی تھی
بوندیں روشن روشن تھیں، گو بادل کالا کالا تھا

اجنبیوں سے دھوکے کھانا پھر بھی سمجھ میں آتا ہے
اس کے لئے کیا کہتے ہو، وہ شخص تو دیکھا بھالا تھا

ہم نہ ملے اور جب بھی ملے تو دونوں نے اقرار کیا
ہاں وہ وعدہ ایسا تھا جو پورا ہونے والا تھا

فکر و نظر کے پرچم اک دم کس نے آ کر چھین لئے
دل والوں نے کیا کچھ دے کر یہ میدان سنبھالا تھا

تپتی دھوپوں میں بھی آ کر ساتھ بہت دے جاتے ہیں
چاند نگر کے انشاؔ صاحب عالی جن کا ہالا تھا

—————— ۱۹۸۲ء

عالی کل اک پربت تھا، اب گرتی ہوئی دیوار
کہنے کو سو کارن ہیں پر کارن ہے وہ نار!

کاہکشاں میں پیار کی، ہم کو ملا اک ایسا چاند
جتنے سورج ساتھ چلے تھے وہ سب پڑ گئے ماند

بھٹک رہا ہوں پر رکھوں گا اسی کا دھیان لگائے
شاید اک دن سچائی خود کھینچ مجھے لے جائے
۱۹۸۲ء

جیون آنچ نے کیا بخشا اک سچے سُر کی پیاس
وہ سچا سُر لگا نہیں اور عالی گئے اداس

صدیوں کے انبار میں بھگوں دیجو کبھی دکھائے
ایک ہی دن جب کوئی کسی کو دکھ نا دے پائے

نا مجھے دھن دے، نا شہرت دے، دے وہ جو مجھ کو بھائے
سونے جیسا پیار کہ جس کو زنگ نہیں لگ پائے

تتلی، جگنو، کوئل، عالی کتنے نام گنائیں
سب ترے پیچھے گھومیں، مہکیں، چہکیں اور جل جائیں

اگر یہ سچ ہے اور یہ سچ ہے پیار خدا کا نام
پھر ہمیں اس کی اک بندی سے پیار پہ کیا الزام

۱۹۸۲ء

شاہ لطیف تمہارے در پر کیا کیا سُر لہرائیں
عالیؔ جیسے من میلے بھی کندن ہو کر جائیں

شاہ لطیف تمہارے سُر کی دنیا میں وہ دُھوم
سندھ کی مٹی جہاں بھی پہنچے لوگ اُسے لیں چوم

۱۹۸۲ء

○

جھلمل جھلمل جگمگ جگمگ خواب سُہانے جاتے ہیں
جانے پہچانے آئے تھے اور ان جانے جاتے ہیں

ایسا لگتا ہے وہ جیسے ہم سے بہت مایوس ہوئے
جیسے پہلے ہم وہ نہیں تھے جواب مانے جاتے ہیں

ہاں اس پاپ نگر میں سب آتے ہیں لیکن فرق یہ ہے
لوگ تو چھپ کر چل دیتے ہیں ہم پہچانے جاتے ہیں

چاک نہیں رکھتے ہیں گریباں رُخ بھی نہیں صحرا کی طرف
اور ابھی تو دیکھ کہاں تک تیرے دوانے جاتے ہیں

اپنے لئے تو مشورت و تنبیہہ کو لایعنی جانا
اب جو سُنا کچھ اُن کو ہوا تو خود سمجھانے جاتے ہیں

خواہش کچھ حاصل کرنا ہے پیار سبھی کچھ دے دینا
یہ بچّھا اور جانے کیوں اُن کو بھی سُنانے جاتے ہیں

اے مستقبل! اے مستقبل! آخر تو کب آئے گا؟
کیسے زمانے آتے ہیں اور کیسے زمانے جاتے ہیں

تھک گئیں ذہن کی روشنیاں اب وہ راہیں دکھلا جن میں
کتنے چاند اور کتنے سورج تیرے بہانے جاتے ہیں

ساری مقدس تحریروں میں پرم گگن کی کرنیں ہیں
ہائے وہ ہم جو اِن کرنوں سے آگ لگانے جاتے ہیں

واں تو ایک سے ایک غزل گو کیا کیا گُن دکھلا بھی چکا
اب کہیئے اب آپ چلے تو کیا فرمانے جاتے ہیں

ان سے نہ پوچھو ہم بتلائیں عالی جی کا حال تمہیں
سیرِ چمن کر آئے ہیں اور خاک اُڑانے جاتے ہیں!

۱۹۸۳ء

پریم اور سمے کا ساتھ نہیں جب بگڑ گئے سب اُستاد
پھر وہ ناری آج تلک ہے من میں کیوں آباد!

آتما اور شریر کے رشتے میری سمجھ سے دور
میں تو یہ جانوں وہ مری ناری اور وہ نور ہی نور

ہوا سے پوچھا کیا لائی ری، کہا سندیسہ لائی!
کہا وہ خوش تھی، کہا نہیں، وہ ہاں کہہ کر پچھتائی

تو جیسی ہے ہم کہہ دیں گے، تو کیوں بات بڑھائے
چندا خود پر کب ریجھے ہے، سُر کب خود کو گائے

روشنیاں ہی روشنیاں ہیں پریم گھروں کے سائے
شرط یہ ہے کوئی اُن کی طرف بن آنکھیں کھولے جائے
۱۹۸۳ء

○

نہ شکایت نہ تقاضا کرنا
دوستوں کو یونہی دیکھا کرنا

وقت اب یہ ہے کہ لازم آیا
ساری دنیا پہ بھروسا کرنا

حال اب یوں ہے کہ آتا ہے پسند
جیسی بھی گزرے گزارا کرنا

ایک دوست ایسا نہیں جو بتلائے
وہ نہ مل پائے تو پھر کیا کرنا

اک مشیر ایسا نہیں جو فرمائے
وعدہ ہو جائے تو پورا کرنا

میں ہوں ناکام تو مت رو کہ مجھے
تیرا منصب نہیں رُسوا کرنا

ہم تو سمجھے تھے کہ ممکن ہی نہیں
شام سے روز سویرا کرنا

اب یہ جانے کہ بہت آساں ہے
ہاں مگر ذکر اُسی کا کرنا

جب کہا اُس نے کہ ہاں میرے سوا
کیوں کوئی اور سہارا کرنا

عرض کی ہے مگر یہ تو بتا
تجھ سے تو منع ہے شکوا کرنا

ختم تدریسِ تمنا سے ہوا
عمر بھر مشقِ تمنا کرنا

چاہتے آپ تو کیا مشکل تھا
کسی بیمار کو اچھا کرنا

لو کہ بے نامیٔ شورش نہ رہی
جاؤ اب خوب تماشا کرنا

زخم روتے ہیں کہ سوزش نہ رہی
اب تمہیں اس کا مداوا کرنا

کیا وہی ہم ہیں کہ تھا عزمِ تمام
چاند سورج نئے پیدا کرنا

اب زمیں پر بھی ہے رہنا الزام
کس لئے بس یہی سوچا کرنا

کاروبارِ غمِ جاناں ہے عجب
درد ہی درد کا سودا کرنا

ایک کیفیتِ بے نام و سبب
یونہی ہنسنا یونہی رویا کرنا

کچھ مری وضعِ جنوں پر نہ سوال
اے کمالِ چمن آرا کرنا

کچھ مرے نام و تخلص کا خیال
اے جمالِ رُخِ زیبا کرنا

تو نے مانگا ہے جو اندازِ سخن
کس طرح سے ترا کہنا کرنا

ہاں وہ دن تھے کہ نہ کرنا کچھ اور
صرف اک کام غزل کا کرنا

کیسے وہ جاں میں سمونے الفاظ
کیا انھیں دل میں ہویدا کرنا

کن مضامیں میں بیاں ہوتا تھا
تیرا جلوہ ترا پردا کرنا

کس محبت کا سماں ہوتا تھا
تیرا منّنا ترا روٹھا کرنا

روز وہ تجھ سے جُدا تیرے حضور
ایک محفل نئی برپا کرنا

نہ وہ لذت نہ وہ شدّت نہ سرور
کس طرح پھر ترا چرچا کرنا

ہم تو اس سب کا سبب بھی کہہ دیں
لوگ کہتے ہیں مت ایسا کرنا

عجزِ عالی ہے قیامت لیکن
دوستو اس کو گوارا کرنا

۱۹۸۳ء

تم کہو دوہا تم کہو بیت اور تم کہو سرستی چھند
نہیں مری من ندی کا طوفاں ناموں کا پابند

اِس دیوانی دوڑ میں بچ بچ جاتا تھا ہر بار
اک دوہا، سو اُسے بھی لے جا، تو ہی خوش رہ یار

سبھی کو بِتا کہنے والا کِس کِس کو پرچائے
پریم کا راجہ بن پرجا بھی راجہ ہی کہلائے

آؤ تمھیں اک بات بتائیں، مطلب جانو آپ
بھنور سے نیچے جا کر دیکھا پانی تھا چُپ چاپ

سورج بادل اوٹ سے جھانکے، مینھ میں بھاگے بار
اک پل رِسلا ہے دیکھیں اور بکھرے روپ ہزار

من بھاشا کو آخر کِس دن سمجھے گا انسان
کتنی بار تو سامنے آ کر بولے ہیں بھگوان

۱۹۸۳ء

امّا بعد

نرم لمحوں کی رنگینیوں
لذتوں شدتوں
کا بیاں
اب بھی ممکن نہیں
سخت لمحوں کی جاں کاہیوں
درد انگیزیوں، اضطرابوں، عذابوں
کی وہ داستاں
اب بھی ممکن نہیں
اے خدا
تو نے اتنا دیا
اب مجھے تابِ اظہار دے
سیج کا آزار دے

۱۹۸۳ء

ں

ہم دونوں نے کی جو محبت اور کسی نے کی ہی نہیں
کیا مطلب، ارے مطلب یہ کہ تجھ جیسی کوئی تھی ہی نہیں

چھم چھم آئیں امیدیں، بولیں اب سب کچھ مل جائے گا
ہاں لیکن وہ کب آئے گا، اس کی خبر تو دی ہی نہیں

اک موسم کے ترکِ جنوں سے کوئی بھرم نہیں بنتا ہے
اگلی بہار آنے والی ہے چاکِ گریباں سی ہی نہیں

ماضی و حال جدا بھی نہیں تھے مستقبل کوئی چیز نہ تھا
تیرے وصال و فراق سے پہلے وقت کی گردش تھی ہی نہیں

دنیا کی پہلی ناری نے نرؔ کا مطلب جان لیا
آج ترا مجھ سے یہ کہنا میں تو کچھ سمجھی ہی نہیں

روز ہزار ارادے باندھے اور ناکام رہے، لیکن
ایسے کتنے ہی گزرے ہیں ایک فقط عاؔلی ہی نہیں

۱۹۸۳ء

تمھارے کالم نہیں ہمارے

ہم اگلی صدیوں کو دیکھتے ہیں
جو اب سے بہتر ضرور ہوں گی

یہ سیدھے سادے بیان چلتے نہیں ہیں
پیارے
تمہارے کالم نہیں ہمارے
اگر کوئی بات شعر کی ہے تو شعر ہی کی زبان لاؤ
نہ لا سکو تو خموش رہ کر خموش جاؤ
تمہیں نہ بولے
تو سترِ عالم کے وہ دریچے
جو آج تک ان گنت کتابوں نے بھی نہ کھولے
کوئی شکایت نہیں کریں گے
یہی کہ تاریخ لکھنے والے تمہارے افکار کی حکایت نہیں کریں گے

تو کیا نہ سوچیں !

تو کیا ہمیں پر یہ جبر ہے بولنے سے پہلے حروف تولیں
تمھیں مبارک تمھاری تنقید کے خزانے
تمھارے ہر روز کے بدلتے ہوئے یہ سانچے
اور ان کے یہ تہ بہ تہ فسانے
ہمیں تو بس بانٹنا ہے اس وقت ہم کو جو دے دیا خدا نے
اگر خدا ہے ——
مگر خدا ہے ——
خدا کے اموال کی جو تقسیم اس کی مخلوق میں کرو گے
تمام سانچوں سے ماورا ہے
خدا کے نزدیک فرض
ایک قرض ہوتا ہے
جس کی بر وقت ادائیگی ہی
فنونِ ظاہر فنونِ باطن کا مدّعا ہے ۔

۱۹۸۴ء

○

آخرش ایک فیصلا آیا
آج سے عشق کا مزا آیا

سحرِ آسانیِ وفا ٹوٹا
ذوقِ جاں کاہیِ جفا آیا

خوش گمانی کی راہ ختم ہوئی
بے یقینی کا مرحلا آیا!

سعیِ صبر و سکوت رخصت ہے
بات کرنے کا حوصلا آیا

بے زبانی کو کیا مسرت ہے
صاف اک حرفِ مدعا آیا

ایسی یورش ہوئی سوالوں کی!
بے خبر ہو کے مبتدا آیا

ایک دنیا عجب خیالوں کی
کھویا کھویا سا اِک پتا آیا

نئے لفظوں کے خیر مقدم پر
نئے معنی کا مسئلا آیا!

فنِ دیوانگی کی منطق میں
بے دلیلی کا آسرا آیا

چھن سے ٹوٹی ہے صبر کی زنجیر
یعنی اَب دِل میں زلزلا آیا

مسکرانے لگی وہی تصویر
جس سے اِک عمر خوف سا آیا

آنسوؤں کو بچا کے رکھنا تھا
بادلوں میں انھیں چھپا آیا

جب یہ کہتا تھا خوب کہتا تھا
آج بھی بس یہ تبصرا آیا

پھر یہ کن کن دکھوں میں بہتا تھا
لیکن اس سے ادب میں کیا آیا

ہاں تو پھر اس کے بعد کیا گزری
جس کے بعد اک نیا خلا آیا

کس تحیّر میں کیا فضا گزری
کس طرح اس کا تذکرا آیا

کیا جلے جا رہی ہے وہ مشعل
پھر وہی شعلۂ نوا آیا

اک برس بعد صرف ایک غزل
کیا کہی اور کیا مزہ آیا

ہم تو گُم تھے سو گُم ہی رہ جاتے
لیکن اِک شخص پوچھتا آیا

یکے از خواجگانِ مشفق سے
حُکم اظہارِ درد کا آیا

باہمہ ایک لفظ کہہ نہ سکے
بے ہمہ سب کا ماجرا آیا

اس نے پوچھا کہ ہائے دیوانے
لطف دیوانگی میں کیا آیا

سببِ شوق خود کو کیا جانے
میں گیا اور یہی بتا آیا

یہ زمیں یوں بھی آگ تھی عالی
اور میں چل کر برہنہ پا آیا

۱۹۸۴ء

ایمن

دن سویا اور رات جاگی

جاگی رات اور سُر ہوئے روشن
اِک اِک سُر سے جھلکے ایمن
ڈیوڑھے پلٹے بڑھت کے درشن
تان سبھاؤ روپ اُبھارن

من کو اِک اِک بات لاگی
دن سویا اور رات جاگی

چاند چڑھا تو اس سے پوچھا
کیا وہ بھی گھر آجائے گا
چاند دِوانہ کچھ نہیں بولا
اور پھر ایسے درد سے ڈولا

اشکوں کی برسات لاگی
دن سویا اور رات جاگی

آج گرہ کا سُر جو اُٹھایا
سارا ٹھاٹھ اُبھر کر آیا
گانے والا دل سے گایا
عالی نے کس دکھ سے سنایا

لوگوں کی بارات لاگی
دن سویا اور رات جاگی

۱۹۸۴ء

ایک کہاوت عالی جی کی اُنہی پہ ثابت ہوئے
اُتّم نام کے رکھ لینے سے اونچا ہوا نہ کوئے

بڑھتی عمر کو جان کمان اور من کو دے سمجھائے
تیر کو جتنا پیچھے کھینچو اور بھی آگے جائے

اس کے ہونٹ تلک پہنچا تھا خوب بڑھا کر شان
لاج کے مارے سبز سے اک دم لال ہوا ہے پان

۱۹۸۴ء

ارتقا

اگر ارتقا اب بھی تخلیق و تفتیش و تحقیق کا سلسلہ ہے
تو پھر ارتقا خود ہی کہنے لگا ہے
کہ اس کا بھی مخزن خدا ہے
خدا ارتقا ہے اور اس سے سوا ہے
اور اس سے سوا کیا ہے
وہ
وہ خدا ہے۔
خدا ہے

۱۹۸۴ء

کتنے شبدوں اور دھیانوں کی چھوٹ رہی ہے آس
اے بھگوان اب ختم بھی کر مری کویتا کا بن باس
۱۹۸۴ء